المنار

تعليم الاسلام كالج ربوه

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

سرپرستی

پروفیسر قاضی محمد اسلم ایم اے (کینٹب)

ادارۂ تحریر!

ہدایت اللہ ہادی

لطیف گجراتی ○ بشیر طاہر

جلد ۱۴ ○ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۶ء ○ شمارہ ۳

جنید ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے شائع کیا،

عکس

متبرکات

اداریہ — ادارۂ تحریر

○ کلام الامام — سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام

○ کلام محمود — سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضؓ

○ مقالات و مضامین — پروفیسر سجاد باقر رضوی

پروفیسر ڈاکٹر اے ڈی ارشد

داؤد طاہر

لطیف گجراتی

اکبر علی ہاجوہ

○ گلہائے رنگارنگ — بدر منیر

محمد انور قریشی

○ شبستان غزل — پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان

عبدالسلام اختر ایم اے۔

مبارک احمد عابد

ہدایت اللہ ہادی

لطیف گجراتی

ایم رفیق ضیاء، قمر کاشمیری

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا
وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۝

ربّنا حاصل ہو صبر ایسا ہمیں
جب تلک دنیا میں ہم جیتے رہیں
تیرے ہی ہو کر رہیں ہر حال میں
گرچہ پیش آئیں ہزاروں مشکلیں
جو مصیبت ابتلا کے رنگ میں
آئے۔ اس کو ہم خوشی سے جھیل لیں
بخش استقلال یارب دمبدم
راہِ حق پر رکھ ہمیں ثابت قدم
ہوں ہماری ہمتیں ایسی بلند
پاؤں جم جائیں جہاں ڈالیں کمند
کافروں پہ فتح حاصل ہو شتاب
قوم ان کی ہم میں شامل ہو شتاب
الغرض ہو ہر جگہ نصرت عطا
بول بالا ہو فقط اسلام کا

اکمل

قال الرسول ﷺ

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا ھُنَّ قَالَ الشِّرْکُ بِاللّٰہِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَکْلُ الرِّبٰوا وَاَکْلُ مَالِ الْیَتِیْمِ وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ (بخاری)

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اے مسلمانو! تمہیں سات تباہ کرنے والی باتوں سے ہمیشہ بچ کر رہنا چاہیئے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ سات باتیں کونسی ہیں؟ آپ نے فرمایا:۔

۱۔ کسی کو خدا تعالےٰ کا شریک ٹھہرانا
۲۔ نظر فریب باتوں کے پیچھے لگنا۔
۳۔ کسی انسان کو ناحق قتل کرنا
۴۔ سود کھانا
۵۔ یتیم کا مال غصب کرنا
۶۔ جنگ میں دشمن کے سامنے پیٹھ دکھانا
۷۔ اور بے گناہ مومن عورت پر بہتان باندھنا۔

تبرکات

:- ارشادات عالیہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام :-

انسان کی تکمیل اور تربیت چاہتی ہے کہ اُس پر ابتلا بھی آئیں

ابتلاؤں کے ذریعہ رضا بالقضاء اور صبر کی قوت بڑھتی ہے

" اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسان کو ایک حالت میں رکھ سکتا تھا مگر بعض مصالح اور امور ایسے ہوتے ہیں کہ اس پر بعض عجیب و غریب اوقات اور حالتیں آتی رہتی ہیں۔ ان میں سے ایک ہم و غم کی بھی حالت ہے۔ ان اختلافِ حالات اور تغیر و تبدل اوقات سے اللہ تعالیٰ کی عجیب در عجیب قدرتیں اور اسرار ظاہر ہوتے کیا اچھا کہا ہے -

اگر دنیا بیک دستور ماندے ؎ بسا اسرار ہا مستور ماندے

جن لوگوں کو کوئی ہم و غم دنیا میں نہیں پہنچتا اور جو بجائے خود اپنے آپ کو بڑے ہی خوش قسمت اور خوش حال سمجھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسرار اور حقائق سے ناواقف اور ناآشنا رہتے ہیں۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ مدرسوں میں سلسلہ تعلیم کے ساتھ یہ بھی لازمی رکھا گیا ہے کہ ایک خاص وقت تک لڑکے بھی ورزش کریں۔ اس ورزش اور قواعد وغیرہ سے جو سکھائی جاتی ہے۔ سررشتہ تعلیم کے افسروں کا یہ منشاء تو ہو نہیں سکتا کہ ان کو کسی لڑائی کے لئے تیار کیا جاتا ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اعضاء جو حرکت کو چاہتے ہیں۔ اگر ان کو بالکل بےکار چھوڑ دیا جائے تو پھر ان کی طاقتیں زائل اور ضائع ہو جاویں اور اس طرح پر اس کو پورا کیا جاتا ہے بظاہر ورزش کرنے سے اعضا کو تکلیف اور کسی قدر تکان ان کی پرورش اور صحت کا موجب ہوتی ہے۔ اسیطرح پر ہماری فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ تکلیف کو بھی چاہتی ہے تاکہ تکمیل ہو جائے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہی ہوتا ہے جو وہ انسان کو بعض اوقات ابتلاؤں میں ڈال دیتا ہے۔ اس سے اس کی رضا بالقضاء اور صبر کی قوتیں بڑھتی ہیں۔ جس شخص کو خدا پر یقین نہیں ہوتا۔ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ ذرا سی تکلیف پہنچنے پر گھبرا جاتا ہے اور وہ خودکشی میں آرام دیکھتا ہے مگر انسان کی تکمیل اور تربیت چاہتی ہے کہ اس پر اس قسم کے ابتلاء آویں تاکہ اللہ تعالیٰ پر اس کا یقین بڑھے "

(الحکم ۱۷ر دسمبر ۱۹۰۲ء)

گزارشاتِ ادارہ

اعتذار

ایک طویل عرصہ کے بعد المنار کا شمارہ ایک مرتبہ پھر آپ کے سامنے حاضر ہے۔ اس کی اشاعت میں اس قدر تاخیر کا سبب چند ناگزیر وجوہات تھیں جنہیں یہاں نہ بیان کرنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔

ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ اس مجلہ کو بہترین مواد کے ساتھ بہترین رنگ میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں اپنی اس سعی میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہوئے ہم یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ کالج کے بہت سے طلباء نے اپنی تحریرات المنار میں اشاعت کے لئے دی تھیں مگر عدم گنجائش کی وجہ ہم ان کی خواہش پوری کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ان طلباء میں سے مبارک احمد ملک، مرزا لقمان، پرویز طارق، طاہر منصور اور نذیر احمد مبشر کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے بالترتیب علامہ اقبال کا فلسفہ خودی، صدا بندی، زندہ ہے قوم جن سے ..... (افسانہ) علامہ اقبال کی شاعری، "اقبال کا فلسفہ خودی" موضوعات پر لکھا تھا۔ اسی طرح مخدوم شاہد نواب، محمد سمیع طاہر، بشیر طاہر اور عاصم صحرائی نے بھی چند اشعار اشاعت کے لئے بھیجے تھے۔

کچھ طلباء نے ہمیں اپنی نگارشات سے نوازا مگر قبل اس کے کہ رسالہ چھپتا وہ اس کالج میں اپنا تعلیمی عرصہ مکمل کر چکنے یا اس کے ایک حصہ کی تکمیل کے بعد اس کالج سے وداع ہو گئے۔ ان میں سے رضی اللہ خان، محمد ذکریا، نسیم سیفی، مبارک طلعت میر اور محمد یوسف بشر کے اسماء کا تذکرہ ضروری ہے۔ ہمارے کالج کے ان سابق طلباء نے علی الترتیب "اطاعتِ رسول"، "غلطی" (افسانہ)، "نمستے گاڈن" (طنز و مزاح)، "دو دل اور ایک سہارا" (افسانہ) اور "توبہ کا اسلامی فلسفہ" وغیرہ عناوین پر قلم اٹھایا تھا۔ ان کے علاوہ سید مبشر خلیل اور آصف حفیظ شیخ کے اشعار بھی اشاعت کے موصول ہوئے تھے۔

ادارہ المنار کے ان سب قلمی معاونین کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہے اور اس بات پر معذرت کا اظہار کرتا ہے کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر ان کی نگارشات المنار کے اس پرچہ کی زینت نہیں بن سکیں ہماری کوشش ہوگی کہ ان مضامین کو المنار کی آئندہ اشاعتوں میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ (ادارہ)

اداریہ!

قلم ہاتھ میں پکڑتے ہی مجھے خیال آیا کہ آج مجھے سب سے پہلے اس دانش گاہِ علم میں داخل ہونے والے نئے دوستوں کی خدمت میں مبارکباد کے سندر سندر اور خوبصورت پھول پیش کرنے چاہئیں ـــــ تو میں سب سے پہلے "تازہ واردانِ مکتب" کی راہوں میں تبریک کے پھول بچھاتا ہوں ـــــ اگر وہ تبریک کے پھولوں کو اپنی شان سے کمتر سمجھتے ہیں تو میں ان کی راہوں میں آنکھیں بچھانے کو تیار ہوں ـــــ لیجئے صاحبان! اب تو آپ خوش ہیں۔ اللہ کرے آپ ہمیشہ ہی خوش رہیں ـــــ

دوستو! آپ کی زندگی اب ایک نئے موڑ ـــــ نئے راستے نئے انداز اور نئی ڈگر کی طرف گامزن ہے آپ نے گزشتہ زندگی میں متحرکانہ جدوجہد اور سعی پیہم اور اپنے قادر و توانا خدا کی رحمتوں کے زیرِ سایہ کامیابی و کامرانی حاصل کی ـــــ آپ سب کو ان تجربات و مشاہدات کا بلکل احساس ہو گیا ہو گا جو آپ کی شاداں اور رواں دواں خوش کن حیات کے لئے بطور اساس کام دے سکیں ـــــ آپ میں سے ہر ایک نے معیارِ زیست پر اُن اقدارِ عظیمہ کو پرکھنے کی تکمیل جستجو کی ہو گی جن کی بدولت کامیابیاں، کامرانیاں اور فتح و ظفر کی مہربانیاں آپ کے دوش بدوش مسکراتی اتراتی لجاتی اور اٹھلاتی ہوئی چلتی رہیں

آپ کی نوخیز عمر میں آپ کے لاشعور اور شعور نے ان خیالات و احساسات کو ضرور بالضرور پہچان لیا ہو گا جو آپ کی ترقیوں اور پیش قدمی کی راہوں میں ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں ـــــ اپنی زندگی کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیجئے۔ اس زندگی میں درخشندہ چراغوں سے مستقبل کے چراغوں کو تابندگی بخشئے۔

ع یوں اک چراغ سے لاکھوں چراغ جلتے ہیں۔

آپ غور سے اپنی حیات کے ان دریچوں میں سے نکلتے ہوئے نور سے اپنے دلوں کو منور کر کے دیکھیں تو یہی جن دریچوں نے آپ کو ظلمت کے اوقات میں خیرہ کن عطا فرمائیں ـــــ ذرا اپنے اذہان اور قلوب میں جھانکئے ـــــ کیا وہاں ماضی کی ترقیات کی وجوہات کے مدہم دھندلے یا نمایاں نقوش نظر آتے ہیں ـــــ کیا کبھی آپ نے ان نقوش کا تجزیہ بھی کیا ہے! ـــ

ساتھیو! آپ کے گزشتہ تجربات و مشاہدات ـــ آپ کی ماضی کی درست اقدار شناسی ـــــ آپ

کے شعور اور لاشعور کی مفکرانہ سوچ ـــــ آپ کے دلوں اور اذہان کی بے مثال علمیت، خیر و شر ـــــ سبھی آپ کو کامیابی، کامرانی، فتح مندی اور ظفریابی کا ایک ہی سنہری اصول بتاتی ہیں ـــــ یہ اصول کوئی نیا اصول نہیں ـــــ انسان ہر دور میں اس اصول کے فلسفیانہ تعقل سے فیض یاب ہوتا رہا ہے ـــــ وہ اصول ہے عمل پیہم ـــــ

عملی زندگی اور علمی زندگی دونوں بلاواسطہ یا بالواسطہ عمل کی مرہون منت ہیں ـــــ عملی زندگی کا تو محور ہی نہیں عمل ہوا ـــ مگر علمی زندگی کا نقطۂ تکملہ بھی عمل ہی ہے ـــــ جس طرح دیا بغیر تیل کے کبھی روشن نہیں ہوتا اسی طرح علم بھی عمل کے بغیر ایک بے مغز خول ہے

ـــــ دوستو! متحرکانہ جدوجہد اور سعی مسلسل ہی ہماری کامیابی کی ضمانت ہیں ـــــ ان دنوں جب آپ ایک نئے دور میں داخل ہوئے ہیں۔ اپنی زندگی میں اس اصول کو ممتاز حیثیت دیں کہ ہم نے ٹھوس اور بار آور کوششوں سے اپنی زندگی کو وہ اقدارِ جلیلہ عطا فرمانی ہیں جن کی بدولت ہم لازوال، ابدی اور امتیازی اوصافِ جمیلہ کے حقدار بن کر اپنی شہرت، عزت اور وقار کو چار چاند لگا سکیں۔

ـــــ آج ہی اپنے دلوں میں یہ مصمم ارادہ اور عزم توانا کر لیں کہ ہم نے اپنی کایا پلٹ کے رکھ دینی ہے۔ ہم نے اپنے معیارِ زیست کو اس اعلےٰ مقام تک لے جانا ہے جہاں ہم ایک درخشندہ سورج کی طرح چمکنے لگیں ـــــ ایسے سورج کی طرح جس کی کرنیں بنی نوع انسان کے لئے بڑائی اور عظمت کا پیغام جانفزا لائیں ـــــ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم عظمت حاصل کرنے "سنہری اصول" کو عملی سانچوں میں ڈھالیں۔ وہی سنہری اصول جس کی رو پہلی چھاؤں میں پل کر محمد علی جناح ایک ناقابل تسخیر لیڈر بنے ـــــ نپولین ایک عظیم فاتح بنا ـــــ اور ہمارے اسلاف نے جس اصول کو آنکھوں کا نور اور دل کا سرور سمجھا ـــــ ہاں! ہاں وہی اصول جس کو عملِ پیہم ـــــ سعیٔ مسلسل ـــــ باقاعدہ محنت اور متحرکانہ جدوجہد کا نام دیا جاتا ہے ـــــ آئیں ہم علم و عمل کے بحرِ بیکراں میں کود پڑیں ـــــ اور عظمت کے موتی ڈھونڈھیں۔

آج ہی نئے عزائم، نئی امنگوں، نئی ترنگوں، نئے ولولوں اور نئے حوصلوں سے یہ مصمم ارادہ لے کر اٹھیں کہ ہم نے تیشۂ عمل سے مصائب و مشکلات کی چٹانوں کو پاش پاش کر دینا ہے۔ ہم نے کانٹوں سے بے نیاز ہو کر اپنی کامیابی کے گلاب حاصل کرتے ہیں ـــــ اور پھر اس گلاب کو اپنی زندگی کے "کالر" پر اس طرح آویزاں کرنا ہے جس طرح مشاہیر تمغہ ہائے امتیاز زیب لباس کرتے ہیں

میرے دوستو! اس دو چار دن کی زندگی کو انتظار اور آرزو کے احساسات کی نذر نہ کر دیں بلکہ اس زندگی کے ہر سانس کو غنیمت جان کر، کمیاب سمجھ کر ان لاتعداد وسعتوں میں ایک پر استعداد عامل کی طرح کود پڑیں

——— جو لامتناہی وسعتوں میں کمال حاصل کرنے والے کندن بن کر چمکتے ہیں اٹھیں اور حوادثِ زمانہ کے روبرو کھڑے ہو کر مسکرائیں ——— فتح مندی آپ کے قدم چومے گی ———

نئی امنگیں ، نئی منزلیں نئی راہیں
نئے چراغ جلاؤ نئے سفر کے لئے

دوسری بات میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ " المنار " آپ کا اپنا رسالہ ہے اگر آپ اس کی قلمی معاونت سے ہاتھ کھینچ لیں گے تو اس کوتاہ دستی کا خمیازہ بھی آپ کو ہی بھگتنا پڑے گا۔ آپ کو اپنی پسند اور اپنے ذوق کی نگارشات صرف اسی وقت میسر آسکیں گی۔ جب آپ ہمیں اپنے ذوق سے آگاہ کریں گے۔ آپ کی بھیجی ہوئی نگارشات ہمارے لئے آپ کے ذوق اور دلچسپی کا آئینہ ہوں گی ——— آپ جو کچھ بھی لکھیں 'المنار' کے معیار کو سامنے رکھ کر اپنے لفظوں اور اپنے ما فی الضمیر کے مطابق لکھیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ آپ کی نگارشات آپ کی قلبی کیفیات، جذبات اور احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہیں ——— اپنے دماغ اور اسلوب کو صحیح قوتِ متخیلہ دو بجائز قوتِ استدلال اور درست فکری کاوش کا خزانہ بنائیں۔ اور آپ کی تحریریں ان شفاف محسوسات کا مونہہ بولتا اشتہار ہوں ———

کیا میں آپ سے یہ امید رکھوں کہ آپ آئندہ ہمیں مایوس نہیں کریں گے ——— اور اپنی گرانقدر اور بیش قیمت تحریروں سے اپنے " ترجمانِ مکتب " کو مزین کریں گے۔ ہم آپ کی حوصلہ افزائی کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ بشرطیکہ آپ بھی ہمارا ساتھ دیں۔ المنار کا معیار بلند رکھنا ایک ضروری مقصد ہے اور یہ بلندی اوروں کی نسبت آپ سے زیادہ تعلق رکھتی ہے ———

مجھے یقین واثق ہے کہ آپ میری ان گزارشات پر دو نہ سہی " ایک کان " تو ضرور دھریں گے ——— کیا میں یہ یقین رکھنے میں حق بجانب ہوں ؟ ——— اور کیا آپ اپنے 'المنار' کا ساتھ دینے کو تیار ہیں ؟ ——— ان سوالوں کا جواب دیں اگر عملی صورت میں ———

(مبارک احمد عابد)

لیجیئے ! زندگی کا ایک اور سال ماضی کے کنوئیں میں ڈوب گیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ تعلیمی سال ابھی کل ہی تو شروع ہوا تھا۔ لیکن نہیں۔ آپ دنوں کا حساب لگائیے۔ کئی تو سینکڑوں کی تعداد میں گزر گئے ہیں۔ بات کچھ بھی نہیں۔ وقت ہمیشہ سے زندگی کا مذاق اڑاتا رہا ہے۔ افسوس کرنے سے کیا حاصل۔ گیا وقت تو نہیں آسکتا، لیکن اگر آپ زندگی کے مقصد کو نہیں سمجھتے تو ماضی یقیناً تابناک ہے۔

زندگی کا یہ دور جس میں سے ہم اور آپ آج کل گزر رہے ہیں بہت ہی قیمتی ہے۔ اس سے لیا اور نقصان،

کیجئے اور اس وقت کو یوں گزاریئے کہ مستقبل میں آپ کو یہ وقت بہت خوبصورت اور زندگی کا ماحصل معلوم ہو اس کے لئے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے کہ اپنے نصب العین کو مت بھولئے۔

علم و عمل ——— اگر زندگی واقعی اسی نصب العین کے لئے وقف کر دی جائے تو دنیا ایک جنت محسوس ہوگی۔ جہنم تو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے وقت کو ضائع کیا۔ اور جب وقت گزر جانے پر انہیں احساس ہوا تو انہیں جھنجھلاہٹ میں صرف ایک ہی کام سوجھا کہ زندگی کو حقیر اور اذیت ناک بنانے کے لئے چند شعلے بھڑکائے اور دنیا ایک وسیع جہنم زار میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن ہمیں تو زندگی کو خوبصورت اور بامقصد بنانا ہے۔ خدائے تعالیٰ کی بنائی ہوئی اس دنیا میں ہزاروں نعمتیں ہیں جن سے دنیا کو شاداب گلستان میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ محنت کی عادت بھی انہیں میں سے ایک ہے اور ہمیں آج کل صرف اسی کی ضرورت ہے پس محنت کیجئے اور خوب محنت کیجئے!!

ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں کہ علم کو چند کتابوں اور مضمونوں تک ہی محدود نہ رکھئے۔ بلکہ علم کی وسعت کو کم کرنے کے لئے اپنے دماغوں اور ذہنوں کو اتنا وسیع کیجئے کہ خود علم حیران ہو جائے۔ آپ شاید اس بات کو مجذوب کی بڑ سمجھیں لیکن خدا کی ایک مخلوق جسے انسان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اتنی قوت ضرور رکھتی ہے۔ آپ کوشش کیجئے اور نتائج کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑتے ہوئے، آپ یقیناً ایسا محسوس کریں گے۔ جیسے آپ نے اپنا مقصد پا لیا ہو۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آمین۔

اصولاً اس شمارے کو موسم تعطیلات سے پہلے شائع ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ع بشر ہے کیا کیجئے! ——— تاخیر ہو ہی گئی۔ اور اب جب کہ یہ شائع ہو رہا ہے پرانا تعلیمی سال کا اختتام ہوا چاہتا ہے اور نیا سال شروع ہو رہا ہے اس لئے میں نو واردان چمن کو تہہ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

یاد رکھئے! المنار تعلیم الاسلام کالج کا بہترین ترجمان ہے اس لئے اس کالج سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو اس پر برابر کا حق حاصل ہے۔ میں نئے اور پرانے سبھی طلباء سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ المنار کو اپنا رسالہ سمجھتے ہوئے ہمارے ساتھ عملی تعاون بھی کریں۔ عملی تعاون سے میری کیا مراد ہے۔ میرا خیال ہے یہ تو آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔ ہاں ہاں! کیوں نہیں ——— وہ یہ کہ المنار ترقی کے راستہ پر بڑھتا چلا جائے اور آپ کا وجود اس کالج اور المنار کا نام اونچا کرنے کیلئے ممد و معاون ثابت ہو اور آپ خود اسے بڑھتا پھلتا دیکھ سکیں! آمین۔

ھدایت اللہ ھادی

کلام الامام

(سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام)

وہ دیکھتا ہے غیروں سے کیوں دل لگاتے ہو
جو کچھ بتوں میں پاتے ہو اُس میں وہ کیا نہیں
سورج پہ غور کرکے نہ پائی وہ روشنی
جب چاند کو بھی دیکھا تو اُس یار سا نہیں
واحد ہے لاشریک ہے اور لازوال ہے
سب موت کا شکار ہیں، اس کو فنا نہیں
سب خیر ہے اسی میں کہ اس سے لگاؤ دل
ڈھونڈو اسی کو یارو بتوں میں وفا نہیں
اس جائے پُرعذاب سے کیوں دل لگاتے ہو
دوزخ ہے یہ مقام یہ بُستاں سرا نہیں

کلام محمود!

(سیدنا المصلح الموعود خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

دوستو! ہرگز نہیں یہ ناچ اور گانے کے دن — مشرق و مغرب میں ہیں یہ دیں کے پھیلانے کے دن !
اس چمن پر جب کہ تھا دورِ خزاں وہ دن گئے — اب تو ہیں اس باغ پر بادِ بہار آنے کے دن
ظلمت و تاریکی و ضد و تعصّب مٹ گئے — آ گئے ہیں اب خدا کے چہرہ دکھلانے کے دن
ہے بہت افسوس اب بھی گر نہ ایمان لائیں لوگ — جب کہ ہر ملک و وطن پہ ہیں عذاب آنے کے دن
پیشگوئی ہوگئی پوری مسیحِ وقت کی! — "پھر بہار آئی تو آئے ثلج کے آنے کے دن"
دوستو! اب بھی کرو توبہ اگر کچھ عقل ہے — ورنہ خود سمجھائے گا وہ یار سمجھانے کے دن'

دردودکھ سے آگئی تھی تنگ اے محمودؔ قوم
اب مگر جاتے رہے ہیں رنج و غم کھانے کے دن

مقالات
و
مضامین!

○ —— سجاد باقر رضوی

○ —— پروفیسر اے۔ ڈی۔ ارشد

○ —— داؤد طاہر

○ —— لطیف گجراتی

○ —— اکبر علی باجوہ

★ سجاد باقر رضوی

مَیں اور تخلیقِ شعر!

سب سے پہلے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ میں اپنے بارے میں آپ سے گفتگو کرنے چلا ہوں۔ اپنے بارے میں گفتگو کرنا نہ صرف خلافِ وضع ہے بلکہ نفسیاتی اعتبار سے بھی شاید احساسِ برتری کا اظہار ہے۔ اب میں اس بے جا حرکت کا ایک توڑ پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ میں آپ سے اپنی اُس ذات کے بارے میں گفتگو کروں گا جو میری نہیں ہے۔ یوں کہیئے کہ وہ "میری" سے زیادہ آپ کی ہے وہ ذات "مجھ" سے بڑی ہے۔ شاید وہ مجھ سے بڑی بھی اسی لئے ہے کہ وہ آپ کی ہے۔ لیجیئے میری اس بات سے وضع بھی نبھ گئی اور ایک عظیم حقیقت کا انکشاف بھی ہو گیا۔ اس لئے کہ شاعری میں ذات، غیر ذات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ اسی بات کو یوں کہتے ہیں کہ شعر میں شخصی و انفرادی، جذبات، احساسات، مشاہدات، کیفیات، سب غیر شخصی و آفاقی بن جاتی ہیں

پیشتر اس کے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ میں شعر کیسے کہتا ہوں میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ میں شاعر کیسے بن گیا۔ میں مشرقی یوپی کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں میرے والد مرحوم شعر کہتے تھے، گاؤں کے پہلے شخص تھے جنہوں نے میٹرک تک انگریزی کی پڑھی تھی لہٰذا وہ بہت تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے، جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنی والدہ کو شاعری کا بدترین دشمن پایا۔ یوں کہ وہ میرے والد کی ہمہ وقت شعر و شاعری سے تنگ رہتی تھیں اور گھر کی معاشی بد حالی اور آمدن کی تنگی کا ذمہ دار والد صاحب کی شاعری کو سمجھتی تھیں۔ والد صاحب مرحوم تندہی سے مصروفِ سخن رہتے، گھر کے باہر شعر و سخن کی محفلیں گرم رکھتے اور کبھی کبھی یہ ہوتا کہ گھر میں گیہوں کی موجودگی کے باوجود، آٹے کی غیر موجودگی کے باعث، ہمیں رات کی روٹی نہ ملتی؟ اور ہم سو جاتے اور پھر بہت رات گئے ہمیں کھانا کھانے کے لئے جگایا جاتا۔

اپنی والدہ کا ایک مشورہ مجھے اب تک یاد ہے کہ "بیٹا دنیا میں کوئی کام کرنا مگر شاعری مت کرنا" اور میں نے اپنی فطری موزونیٔ طبع کے باوجود شاعری نہ کرنے کا قصد کر لیا۔ یوں کبھی کبھی والد صاحب سے

اپنی غزلوں پر اصلاح لیتا اور مشاعروں میں شعر بھی پڑھتا مگر والدہ صاحبہ کی نصیحت کانوں میں ہمہ وقت گونجتی رہتی۔ قصہ مختصر یہ کہ میں شاعری کو بے کاری کا مشغلہ سمجھتا رہا۔

بہر حال اس وقت میں آپ کے سامنے بحیثیت شاعر کھڑا ہوا ہوں۔ میں نے آپ کو ابھی یہ بتایا ہے کہ میں نے شاعری نہ کرنے کا قصد کر لیا تھا اور میں نے یہ بھی کہا ہے کہ میں شاعری کو بے کاری کا مشغلہ سمجھتا تھا۔ میں اب بھی ان دونوں باتوں کو مانتا ہوں، مگر میں اب یہ سمجھتا ہوں کہ میری شاعری اور ان دو باتوں میں بظاہر تضاد ہوتے ہوئے بھی کوئی تضاد نہیں ہے اور وہ یوں کہ میں شاعری کرتا نہیں شاعری مجھ سے ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ میرے لئے شاعری کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے میں کرتا ہوں، اس لئے منطقی طور پر دیکھئے تو ان لمحات میں جب میں شعر کہتا ہوں، میں بے کار ہوتا ہوں ——— اسی بات کو یوں بھی سمجھئے کہ آپ کوئی کام، کوئی عمل کسی اور مقصد کے حصول کے لئے کرتے ہیں ——— اس طرح وہ کام، وہ عمل کسی خاص مقصد کے حصول کا محض ذریعہ ہوتا ہے ——— لیکن شعر میں ذریعہ اور مقصد یکجا ہو جاتے ہیں۔ یوں کہئے کہ شعر مقصود بالذات ہوتا ہے۔ لہٰذا شعر کہنا کوئی کام، کوئی عمل اس مفہوم میں نہیں ہے جس میں ہم بالعموم ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔ اس نکتہ کو ایک اور طرح دیکھئے۔ ہمارے ہر کام میں ہمارا ارادہ شامل ہوتا ہے لیکن شاعری میں ہمارے ارادے کو دخل نہیں ہوتا لہٰذا یہ بالارادہ فعل نہیں ہے اور اس لئے میں اب بھی اسے بے کاری کا مشغلہ کہتا ہوں ——— یہ الگ بات ہے کہ یہ بیکاری اور یہ شغل دونوں جب شعر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو قابل قدر ہو جاتے ہیں، قدر بن جاتے ہیں۔ شاعری قدر ان معنوں میں ہے جن معنوں میں ہر تخلیق قدر بن جاتی ہے۔

میں نے شاعری کو قدر اور تخلیق کہا ہے، شاعری کو چھوڑیئے۔ آپ کوئی عمل لے لیجئے، وہ اس حد تک قابل قدر ہوگا، اس حد تک تخلیقی عمل ہوگا جس حد تک آپ اسے بطور خود ایک مقصد سمجھیں گے یا الفاظ دیگر جس حد تک وہ مقصود بالذات ہوگا۔ قابل قدر اور تخلیقی ہوگا۔ مثال کے طور پر جسم کی صفائی اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر کالج آنا بہت اچھی بات ہے تاہم اگر وہ محض کالج کی تنظیم کو نبھانے کا ذریعہ ہے تو قابل قدر نہیں۔ البتہ اگر وہ بطور خود مقصود بالذات بھی ہے تو قابل قدر ہے۔

دیکھئے بات دور نکل گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں شاعری کو بالارادہ فعل تصور نہیں کرتا ——— شاعری تخلیق ہے، جس میں ارادے کو دخل نہیں۔ لیجئے گھوم پھر کر بات وہیں آ گئی کہ میں شعر کیسے کہتا ہوں دراصل یہ سوال ہے جس کا خاطر خواہ جواب شاید میں نہیں دے سکتا اور اسی لئے دو سیدھی سیدھی باتوں کے بجائے میں موضوع کے اردگرد چکر لگا رہا ہوں۔ تاہم اسی اثنا میں آپ کو شاعری کے بارے میں دو باتیں

بتا چکا ہوں (۱) شاعری میں ذات، غیر ذات بن جاتی ہے (۲) شاعری ایک تخلیق ہے، جو مقصود بالذات ہے اور جس میں انسانی قوتِ ارادی کو دخل نہیں۔ یہ شاعری کے بارے میں عام نظریات ہیں جنہیں میں بھی مانتا ہوں۔ اب ان باتوں کو ذہن میں رکھیے اور میرے ذہن کے اس عمل کے بارے میں سنیے جس کا نتیجہ میری شاعری ہے۔ اسے بھی ملحوظ خاطر رکھیے کہ میں اپنے ذہن کا محض ایک ظاہری اور سطحی تجزیہ کر رہا ہوں در اصل کیا ہوتا ہے، یہ بات اُسے معلوم ہے جو میرا خالق ہے۔ مجھ میں اور میرے خالق میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تخلیق کی پوری ساخت و باخت سے باخبر ہے اور میں بے خبر۔

بہرحال کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹھے بیٹھے، چلتے پھرتے، کچھ الفاظ ذہن میں گونجنے لگتے ہیں، وہ خیال نہیں الفاظ ہوتے ہیں یا کم از کم ننانوے فیصدی صورتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ الفاظ تیزی سے گردش کرتے ہیں آپس میں ٹکراتے ہیں اور کسی آہنگ کی ڈور میں بندھ بندھ پڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ آہنگ یا بالوزن بے معنی مصرع ذہن میں آتا ہے کبھی لفظ اور آہنگ ساتھ ساتھ ابھرتے ہیں۔ اکثر الفاظ کسی آہنگ کے ساتھ گڈمڈ ہو کر ذہن میں ابھرتے ہیں اور پھر ایک واضح ایک معنی دار شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ذہن کی کونسی قوت ایسی ہوتی ہے جو اس آہنگ کو پیدا کرتی ہے اور آہنگ کے مناسب الفاظ جمع کرتی ہے۔ میں یہ نہیں جانتا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ لفظ پہلے آتے ہیں یا آہنگ، جذبہ پہلے پیدا ہوتا ہے یا آہنگ یا لفظ، یہ بھی کچھ نہیں جانتا ——— البتہ میں یہ جانتا ہوں کہ کبھی کبھی کسی شدید جذبہ یا تاثر کے تحت کوئی شعر کہنا چاہتا ہوں تو نہیں کہا جاتا اور جب اس جذبہ اور تاثر کو بھول جاتا ہوں تو کسی اور موقع پر شعر وارد ہونے لگتے ہیں جنہیں میں بعد میں شناخت کرتا ہوں کہ یہ وہ تاثر یا وہ جذبہ ہے جسے میں فلاں فلاں وقت میں شعر میں سمونے کی کوشش کر چکا ہوں یا انہیں شعر بنانے کی سعی بے کار مان کر چپ بیٹھ رہا ہوں۔

میرے شعر کہنے کی ایک اور صورت ہے۔ میں نے اکثر غزلیں مصرع طرح پر بھی کہی ہیں۔ اب سے کوئی ۲۵ یا ۳۰ برس پہلے یہ خیال عام تھا اور میرا خیال ہے اب بھی اردو تنقید کا یہ ایک عام مفروضہ ہے کہ شعر جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ شاعری کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور اس کی اپیل بھی دل کو ہوتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی بھی یہی کہتے تھے۔

شعر در اصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

مگر میرا خیال یہ ہے کہ شاعری کی اپیل اور ہارٹ اٹیک میں بہت فرق ہے۔ شاعری کا حملہ اگر

براہ راست دل پہ ہو تو وہ بیماری ہے شاعری نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ شاعری محض جذبات اور کیفیات کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ شاعری پوری انسانی ذات کا معاملہ ہے، حواس، تخیلہ، وجدان، خیالات، تصورات، جذبات، کیفیات، احساسات سب کا معاملہ ہے۔

تیسری بات یہ کہ شاعری میں جذبہ اور خیال سے زیادہ اہم الفاظ ہوتے ہیں۔ لفظ ہماری پوری ذات کی نمائندگی کرتا ہے۔ شاعری میں یہی مواد ہوتا ہے اور یہی اوزار۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے اکثر غزلیں مصرع طرح پر بھی کہی ہیں ——— طرحی غزل کہتے ہوئے میں بالعموم یہ کرتا ہوں کہ اکثر اس طرح مصرع کو اپنے ذہن میں بار بار دہراتا ہوں چپکے چپکے گنگناتا ہوں (یہاں میں اس بات کی صراحت کرنا چاہتا ہوں کہ میں نہایت بے سُرا ہوں۔ مگر بے سُرے اور بھونڈے گلے کے آدمیوں کو دو طریقوں سے گنگنانے کی اجازت ہونی چاہیئے، ایک نہاتے ہوئے اور دوسرے دل ہی دل میں) ——— ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں مصرع کو گنگناتا ہوں۔ چپکے چپکے ——— دل ہی دل میں ——— اور پھر وہ مصرع ایک آہنگ بن کر ابھرتا ہے ——— بالعموم میرے ذہن میں ایک قافیہ مع ردیف کے کود پڑتا ہے۔ پھر اس آہنگ کے ساتھ یہ قافیہ اور ردیف مل کر کئی اور لفظوں کے ساتھ مل کر ایک جیتا جاگتا سا مصرع بن جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس قافیہ اور ردیف کی رہنمائی میں ایک معنی دار مصرع بن جاتا ہے ——— بالعموم دوسرا مصرع پہلے ذہن میں آتا ہے اور پھر اس کی رعایت سے پہلا مصرع بنتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ غزل کہنے والے اسی طرح کہتے ہیں۔ مگر اب سے ۲۵، ۳۰ برس پہلے جب شاعری کو جذبہ کا اظہار سمجھا جاتا تھا تو شاعر یہ کہتے ہوئے عار محسوس کرتے تھے۔ وہ یہ جتانا چاہتے تھے کہ وہ جذبات کی رو میں شعر کہتے ہیں اس لئے پہلا مصرع پہلے اور دوسرا بعد میں کہتے ہیں۔ اگر یہ توجیہ فضول ہے، شاعری محض ہماری تخلیقی قوتوں کا اظہار ہی نہیں یہ ایک فن بھی ہے ——— میں تو سمجھتا ہوں کہ اچھی شاعری وہ ہوتی ہے جس میں فطرت اور فن یکجا ہوتے ہیں۔ ہماری تخلیقی قوت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ تخلیق کا اظہار ہمیشہ تناسب اور توازن کے ساتھ ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر فن کارانہ ہوتا ہے اور فن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خارجی فطرت اور داخلی فطرت دونوں کی کارفرمائی کو ہم فن کے ذریعے ہی سمجھ سکتے ہیں گویا تخلیقی قوت فن کے بغیر انتشار ہے اور فن تخلیقی قوت کے بغیر بنجر ہے۔ (یہاں آپ شاید یہ شک کریں کہ اس طرح شعر کہنے میں میرا ارادہ بھی شامل ہو جاتا ہے، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے ارادے کو اپنی قوتِ تخلیق کے سپرد کر کے خود پیچھے ہٹ جاتا ہوں)

ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ میں بالعموم دوسرا مصرع پہلے اور پہلا مصرع بعد میں کہتا ہوں مگر یہ خیال ضرور رکھتا ہوں کہ دونوں مصرعے ایک دوسرے کے لئے جواز ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ پورے شعر کا ایک ایک لفظ شعر میں اس طرح ہو جیسے گھر میں عزیز و اقارب یا محفل میں دوست احباب ـــــــ کوئی اجنبی یا نامحرم گھر میں نہیں آ سکتا اور کوئی اجنبی یا بور شخص محفل کو بدمزہ کر دیتا ہے ـــــــ آپ لفظوں کو اشخاص کے مترادف سمجھیں، ان کے لہجے اور اشارے ہوتے ہیں، مزاج اور تیور ہوتے ہیں، ان سے اسی طرح مانوس ہونا پڑتا ہے جیسے زندگی میں انسانوں سے۔ بقول محمد حسین آزاد وہ انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور انہی کی طرح مر جاتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں جس شخص کے مزاج تیور، لہجے، اور اشارے کو آپ نہیں سمجھتے اُسے آپ اپنی صحبت، اپنی انجمن میں کیسے بٹھائیں گے، کیا وہ آپ کے ذہن پر بوجھ نہیں بنا رہے گا! کیا وہ آپ کے مزے کو کرکرا نہیں کرے گا۔

یہاں ایک اور اہم بات سمجھنے کی ہے۔ اگر آپ نے اپنے فن کو اپنی تخلیقی قوت سے زندہ رکھا ہے اور اگر آپ کی تخلیقی قوت آپ کے فن کی تنظیم قبول کر لیتی ہے، بہ الفاظ دیگر آپ کے شعور اور آپ کے لاشعور میں رابطہ اور یگانگت ہے تو آپ فن کے سہارے زندہ شعر اور تخلیقی قوت کی بیداری میں اور اس کے اشارے پر فنکارانہ شاعری کر سکتے ہیں۔ (اس بات کو آپ اپنی زندگی پر بھی منطبق کر سکتے ہیں۔ ہر شخص کا شاعر ہونا ضروری نہیں مگر ہر شخص کا تخلیقی زندگی بسر کرنا ضروری ہے۔ آپ اپنی تخلیقی قوتوں کو منظم کریں گے تو فن کی اعلیٰ سطح پر زندگی بسر کریں گے، یا اگر آپ زندگی کا فن سیکھ لیں گے اور اس کا تعلق آپ کی تخلیقی قوتوں کے ساتھ ہوگا، تو زندگی کی اعلیٰ ترین صورتیں پیدا ہوں گی)

میں آپ کو اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ مجھے ایک بار حیدر آباد دکن سے ایک خط ملا۔ خط بھیجنے والے نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں فراق گورکھپوری کی ایک غزل کے ایک مصرع پر غزل لکھوں اور انہیں بھیجوں۔ مصرع یہ تھا:-

"سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں"

اس قسم کے خطوط اور بہت سے کہنہ مشق اساتذہ کے پاس بھی آتے تھے۔ میں نے بھی طبیعت کی اور چند شعر کہہ لیے ـــــــ شام کے چار پانچ بجے تھے، میں پلنگ پر لیٹ خدا سے چھوٹی سی دعا مانگتا رہا کہ اللہ تعالیٰ! میں یہ غزل کہہ رہا ہوں ذرا اچھے اچھے شعر ہو جائیں تو میں بھی اپنی غزل بھیج سکوں، کہیں اوروں کے مقابلے میں میری غزل پھس پھسی نہ ہو جائے اور میں یہ دعا مانگتے مانگتے سو گیا۔ ابھی ایک گھنٹہ سویا تھا کہ میری آنکھ کھلی دو پورے مسلّم شعر مجھ پر نازل ہوئے۔ میں نے انھیں کاغذ پر لکھا اور پھر سو گیا

کہ جاگنے پہ پھر انہیں دیکھوں گا اور جب میں نے سو کر اٹھنے کے بعد انہیں دیکھا تو وہ شعر بلا کسی ترمیم کے میں نے غزل میں شامل کر لئے، آپ بھی سنئے:

لفظ و معنی میں نہیں ربط مگر ہائے امیر!
اس پہ بیٹھے ہیں کہ وہ ٹالنے والا بھی نہیں،
بے خودی ہائے تمنا، کہ نہ تھی فرصت دہم!
بے کسی ہائے تماشا، کہ کوئی تھا بھی نہیں

میں نے آپ کو یہ شعر یہ بات واضح کرنے کے لئے سنائے ہیں کہ فن کا پورا شعور تخلیقی قوت کو تحریک دیتا ہے، اس کے برعکس جب منظم تخلیقی قوت خود تحریک پاتی ہے تو فن کاری کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔ البتہ اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھئے کہ اگر فن اور قوت تخلیق کا تناسب بگڑا تو فن کا زیادہ دباؤ شعر میں تصنع پیدا کر دے گا اور اگر قوت تخلیق کا دباؤ زیادہ ہوا تو جذباتیت پیدا ہوگی۔ تصنع اور جذباتیت یہ دونوں خرابیاں بالعموم یوں پیدا ہوتی ہیں کہ شاعر اپنی شخصیت اور اپنی انفرادیت کے بارے میں ضرورت سے زیادہ باشعور ہو جاتا ہے اور شاعری نام ہے فطرت اور ذات کو فن میں چھپانے کا ــــ یا اسے یوں کہہ لیجئے کہ اپنی ذات کے بجائے غیر ذات کے اظہار کا ــــ یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ تصنع اور جذباتیت شاعری کی طرح زندگی میں بھی اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ ہم دوسروں کے بجائے اپنی ذات کو اہم سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور ہمہ وقت اپنی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار میں لگے رہتے ہیں۔

میں ایک اور کام کرتا ہوں اور اس کی رائے آپ کو بھی دیتا ہوں۔ عظیم انسانوں کے کارناموں کا مطالعہ کیجئے، ان کارناموں میں ان کی روحانی عظمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان کارناموں کے مطالعہ سے چاہے وہ شاعری کے کارنامے ہوں یا زندگی کے، آپ کی روحانی عظمت کو ان کارناموں میں چھپی ہوئی روحانی عظمت سے گفتگو کا موقع ملے گا ــــ اسی عظمت کا تصور ہی آپ کو زندگی کی عظیم تر سطحوں پر لے جائے گا ــــ مجھے احساس ہے کہ مجھے وہ عظیم تر سطحیں ابھی نہیں ملیں ــــ شائد کبھی نہ ملیں ــــ لیکن میں جستجو کر رہا ہوں اور آپ کو اس جستجو کی دعوت دیتا ہوں ــــ

مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس جستجو میں کامیابی کے مواقع زیادہ حاصل ہیں۔ محترم استاد الاساتذہ جناب قاضی اسلم صاحب آپ سے قریب اور مجھ سے دور ہیں، اس کے باوجود میں مشورہ کا حق رکھتا ہوں ــــ آپ میرے کہنے سے ایک راز کی بات یاد رکھیں کہ شاعری اور زندگی دونوں میں ایک ہی اصول کارفرما ہے اور وہ اصول تخلیق ہے۔ بڑی شاعری اسی اصول کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور اسی پر اعلیٰ تر

زندگی کا دار و مدار ہے ——— میں بھی اسی راز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اور اب سب سے آخری بات ——— ان لمحات میں۔ جن میں میں شعر نہیں کہتا اور ظاہر ہے کہ تخلیقِ شعر کے لمحات بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ میں اپنے شعور میں اضافہ کرتا ہوں۔ اپنی ننھی سی ذات کو وسعت دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ کتابیں پڑھتا ہوں، بزرگوں کی باتیں سنتا ہوں، چھوٹوں سے گفتگو کرتا ہوں، اپنے اور دوسروں کے جذبات و احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں ——— اور جب میں تخلیق کا دباؤ محسوس کرتا ہوں تو میں خود کو بھول جاتا ہوں، میرے سامنے لفظ ہوتے ہیں، میں انھیں گرفت میں لینا چاہتا ہوں، وہ مجھ سے بھاگتے ہیں، عجب کشمکش ہوتی ہے اور جب میں لفظوں پر قابو پا لیتا ہوں تو معنی کی ایک چھوٹی سی مملکت میرے قبضے میں آجاتی ہے ——— اس پر میں خوش بھی ہوتا ہوں اور عاجز بھی، خوش اس لئے کہ میں نے معانی پر فتح پائی اور عاجز یوں کہ ایک حقیر سی چیز ہوتے ہوئے بھی میرے خدا نے مجھے یہ قوت بخشی، اور پھر اس خوشی اور عاجزی دونوں کو میں اس احساس میں سمیٹ لیتا ہوں کہ یہ مملکت میری نہیں، میری اس ذات کی ہے جو مجھ سے بڑی ہے۔ یعنی آپ کی ہے۔

—:—

نمایاں کامیابی

قارئینِ المنار کے لئے یہ خبر خوشی کا موجب ہوگی کہ ۱۹۶۶ء کے دوران ہمارے کالج کے دو طالب علموں نے یونیورسٹی اور بورڈ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونیوالے مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ محمد لطف اللہ نے بی اے آنرز (ریاضی) سال دوم میں ۳۰۹/۴۰۰ نمبر حاصل کر کے یونیورسٹی بھر میں اوّل اور عبدالستار خان نے ہائر سکنڈری ایگزامینیشن (ہیومینیٹیز گروپ) میں بورڈ میں چوتھی پوزیشن حاصل کی اور MERIT SCHOLARSHIP کے مستحق قرار پائے۔

خدا تعالےٰ ان کے اس اعزاز کو خود ان کے لئے اور کالج کے لئے عزت و خیر و برکت کا موجب بنائے اور ان کی یہ شاندار کامیابی ان کے لئے مزید کامیابیوں کی پیامبر ثابت ہو۔

(ادارہ)

—:—

پروفیسر ڈاکٹر اے ڈی ارشد
ایم اے ایم او ایل پی ایچ ڈی

فیضی کے مذہبی عقاید! اسکی تصانیف کی روشنی میں

مسلمانان پاک و ہند کی دینی اور ثقافتی تاریخ میں مغل شہنشاہ اکبر کا عہد حکومت (۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ) اس لئے بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے دوران مذہب کے نام پر بے شمار تحریکیں وجود میں آئیں اور انہوں نے افکار اسلامی پر گہرے نقوش ثبت کیئے۔ ان تحریکوں میں تصور امام، عقیدہ مہدویت، نظریہ الفی، دین الٰہی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مذہبی تحریکیں صرف مسلمانوں ہی میں نہیں ہندوؤں میں بھی پیدا ہوئیں چنانچہ بھگتی کی تحریک نے ترقی پاکر اسلامی تصوف کے ساتھ گہرا ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جس کا بالواسطہ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مذہب کے معاملہ میں کچھ مصالحت پسندانہ روش اختیار کرنے لگے۔ ادھر اکبر نے اپنی غیر مسلم رعایا پر قابو پانے کے لئے اپنی سیاسی پالیسی کے تحت کچھ طریقے اختیار کیے جو حد اعتدال سے بڑھ کر مذہبی انتشار اور دینی گمراہی کے روپ میں ظاہر ہوئے۔ ان کی نسبت علماء و صلحائے اسلام میں بھاری اختلاف پیدا ہوگیا۔ ایک طبقہ اکبر کی مصلحت کوشی کو روا قرار دیتا تھا تو دوسرا اسے خارج از اسلام اور کافر گردانتا تھا۔ بہر حال مذہبی رواداری کے نام سے اکبر نے جو پالیسی اختیار کی اس سے ملک میں سارا مذہبی ماحول ابتر ہوگیا۔ شریعت اور سنت سے بے اعتنائی عام ہوگئی۔ دربار میں اسلامی شعار کی کھلم کھلا تضحیک ہونے لگی۔ ملا عبد القادر بدایونی (عہد اکبری کے مشہور مورخ) نے اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں ان بدعتوں اور غیر اسلامی حرکتوں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ جو بادشاہ کی طرف سے اعلانیہ سرزد ہوتی تھیں اور جن سے اسلام کی روح مجروح ہوتی تھی۔

اگر ملا عبد القادر کے بیانات کو ایک متعصب اور غیر معتدل ملا کے نظریات قرار دے کر قابل اعتنا نہ سمجھا جائے تب بھی بعض ایسے قطعی شواہد تاریخوں میں موجود ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کے دل میں اسلام

کی عظمت پہلے جیسی اہم نہیں رہی تھی۔ (الناس علی دین ملوکہم) کے مصداق بادشاہ کی اس بے راہ روی نے عوام کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ دینی زندگی کا کوئی ایک شعبہ نہ تھا جو اثر پذیر نہ ہوا ہو۔ یہاں تک کہ مدرسے اور خانقاہیں بھی اس ماحول کے مسموم اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ صوفیوں نے شریعت کو طریقت سے علیحدہ کرکے اپنے غیر شرعی اعمال کا جواز تلاش کر لیا۔ علماء سُو نے فقہ کو اپنی بہانہ جو فطرت کا آئینہ بنایا اور حیلہ بازی کا وہ دور شروع ہوا کہ بقول ملا عبدالقادر بدایونی "اسرائیلیوں کے حیلے بھی ان کے سامنے شرمندہ ہو کر رہ گئے" (بحوالہ منتخب التواریخ ج ۲ - ص ۲۰۳) اگرچہ صاحب الرائے علماء کا طبقہ اکبر کی حرکات کو قطعی طور پر شریعت اسلامی کے منافی قرار دیتا تھا مگر علماء سُو نے اجتہاد اور بدعت حسنہ کے دلفریب عنوانات سے گمراہیوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔

اس تمام ابتری کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ۹۸۲ھ (۱۵۷۵ء) میں اکبر نے فتح پور سیکری میں عبادت خانہ کے نام سے مذہبی مباحثہ کا مرکز تعمیر کروایا۔ شروع شروع میں صرف مسلمان علماء و اکابر کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی اور مذہب کے مختلف مسائل پر مباحثہ کی ابتداء ہوئی۔ ان مباحث سے اکبر کا مقصد تلاش حق تھا اور وہ خلوص نیت سے دینی معاملات پر معلومات حاصل کرنے کی غرض سے علماء کو مدعو کرتا تھا۔ لیکن علماء نے ہنگامہ آرائی شروع کر دی اور عبادت خانہ کو دنگل میں تبدیل کر دیا۔ اکبر اس ماحول سے برگشتہ خاطر ہو گیا۔ جن علماء کو وہ امام رازیؒ اور امام غزالیؒ کے رتبے کا سمجھتا تھا وہ اپنے کردار کے باعث ننگ دین ثابت ہوئے۔ انتظام سلطنت میں دربار کے علماء کی دراز دستیاں بھی اکبر کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھیں۔ اور ان کا وجود اکبر کی آزاد سیاسی پالیسی میں رکاوٹ ثابت ہو رہا تھا۔ اکبر ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

عبادت خانے کے مباحثے بامر مجبوری بند کر دیئے گئے۔ اور حالات سے نمٹنے کے لئے ۹۸۷ھ میں شیخ مبارک ناگوری (فیضی کے باپ) نے ایک اہم دستاویز جس کا نام محضر نامہ تھا مرتب کی۔ اس پر علماء وقت کے دستخط کروائے گئے اور نص قرآنی "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" کا سہارا لے کر اعلان کر دیا گیا کہ "مرتبہ سلطان عادل عند اللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است" اس دستاویز کے نفاذ پر علماء دربار بے دست و پا ہو کر رہ گئے اور اکبر کو دنیاوی معاملات کے علاوہ دینی معاملات میں بھی ملک کا آخری سربراہ تسلیم کیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد اکبر کے دینی رجحانات میں نہایت تیزی کے ساتھ تبدیلی واقع ہونے لگی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بقول بدایونی دربار میں آئمہ اسلام کی توہین کی جانے لگی اور کئی رنگ سے اسلام کے ارکان دین کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ یہ سلسلہ اتنی بڑھی کہ ۹۸۸ھ میں "دین الٰہی" کی تشکیل کی گئی۔ اور ایک نئے فتنہ کو مذہبی رنگ میں پیش

کیا گیا۔ فیضی اور اس کے بھائی ابوالفضل پر یہ الزام ہے کہ انہوں نے اس دینی انتشار اور فتور کی رہنمائی کی اور بادشاہ کو ورغلایا نیز اسے دین اسلام سے منحرف کر دیا۔ فیضی (متوفی ۱۰۰۴ھ) دربار اکبری میں ملک الشعراء اور اکبر کا معتمد تھا۔ ابو الفضل (مقتول ۱۰۱۱ھ) اکبر کا وزیر اعظم اور معتمد خاص تھا۔

اس الزام کی صداقت یا عدم صداقت کے متعلق رائے دینے سے قبل ہمیں ابھی درباری ماحول کے متعلق کچھ اور بھی کہنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حب جاہ و زر کے جذبہ نے بعض علمائے وقت خصوصاً علمائے دربار کے ضمیر کی آواز کو اس قدر مردہ کر دیا تھا کہ بادشاہ کی خوشنودی مزاج کی خاطر ہر قسم کے غیر شرعی فتوے دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اکبر کو سر دربار سجدہ کرنے کا فتویٰ قاضی خان بدخشانی نے دیا تو ملا عالم کابلی کو اس کا افسوس ہوا کہ یہ اجتہادی فضیلت اُسے کیوں میسر نہ آئی۔ (دیکھئے منتخب التواریخ ج: ۳ ص ۱۵۳ و ۲۷۰) شیخ تاج الدین معرفہ تارج العارفین نے اس بدعت کو مزید تقویت دی اور اس کا دربار کا نام قرار دیا۔ داڑھی منڈوانے کی حدیث شیخ ارمان پانی پتی کے بھتیجے نے نکالی (مطابق منتخب التواریخ ج: ۲ ص ۲۷۸) متعہ کا جواز خود ملا عبدالقادر بدایونی نے قرار دیا۔ (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۰۹) فرضیت حج کے اسقاط کا فتویٰ مخدوم الملک کے ذہن رسا کا نتیجہ تھا (مخدوم ملک ملا عبداللہ سلطان پوری عہد ہمایوں و اکبر میں شیخ الاسلام تھے) شیخ تاج الدین اجودھنی دہلوی نے یہاں ارشاد فرمایا کہ قرآن اور پران ایک ہی چیز ہیں۔

علمائے سوء کی ایسی اجتہادی سرگرمیوں نے مذہب کی روح کو مردہ کر دیا اور شریعت و سنت سے بے اعتنائی عام ہو گئی۔ بادشاہ کی رضا کو علماء و اکابر نے اپنی نجات کا پروانہ سمجھا۔ دین الٰہی میں جو لوگ شامل ہوئے ان میں فیضی کا نام نمایاں حیثیت سے ہے اور ہونا بھی چاہیئے تھا اس لئے کہ فیضی دربار اکبری کا ایک اہم رکن تھا۔ نیز اکبر سے اس کی قربت اس عمل کا تقاضا بھی کرتی تھی۔ فیضی کو اس کے سوا چارۂ کار بھی نہ تھا کہ دربار سے وابستگی کے سبب بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملاتے اور اس کی مذہبی پالیسی کو جو دراصل سیاسی پالیسی تھی کامیاب بنانے میں امداد کرے۔ یہ درست ہے کہ اس نے دین الٰہی کا ایک سرکردہ رکن بننا قبول کیا۔ مگر دربار میں جن بدعات اور غیر شرعی حرکات کا ارتکاب ہوتا تھا ان میں سے کسی ایک کی اختراع بھی فیضی سے منسوب نہیں۔ ہر چند کہ بدایونی فیضی کی ذات اور اس کے افعال پر جب بھی اسے موقع ملتا ہے کوئی نکتہ چینی کرتا ہے مگر اس نے فیضی کو اکبر کی کسی بدعت یا غیر شرعی مسئلہ کا مخترع قرار نہیں دیا ایسے اور لوگ تھے جن میں سے بعض کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

با ایں ہمہ فیضی بدایونی کے عتاب سے بچ نہیں سکا یہی نہیں کہ اُس نے فیضی کو اکبر کا ہمنوا کہا بلکہ یہ بھی کہا کہ اکبر کو اس نے گمراہ کیا اور دینی انتشار پیدا کرنے میں مدد دی۔ اس کے علاوہ فیضی پر اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی شدید الزامات عائد کئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "فیضی اہل اسلام سے عداوت اور عناد رکھتا تھا۔ دین اسلام کو برا بھلا کہتا تھا۔ صحابہ کرام، تابعین اور

صالحین کی اہانت و مذمت کرتا تھا۔ وہ بزرگ جو وفات پا چکے ہیں اور جو زندہ ہیں سبھی کی بے حرمتی کرتا تھا۔ اس کی اسلام دشمنی اس حد تک تھی کہ تمام یہودی۔ نصرانی۔ ہندو اور مجوسی اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ (بحوالہ منتخب التواریخ ج ۳: ص ۲۹۹)

اُس زمانے کے محدث اعلیٰ الشیخ عبدالحق دہلوی سے فیضی کو بے حد عقیدت تھی اور انہیں بھی فیضی سے تعلقِ خاطر تھا۔ یہاں تک کہ حج کے لئے روانہ ہونے سے قبل انہوں نے شیخ لودسیکری میں فیضی کے ہاں قیام فرمایا۔ جب حج سے واپس آئے اور سنا کہ دینِ الٰہی کی ترویج سے فیضی کے عقائد میں تغیر واقع ہوا ہے تو انہوں نے فیضی سے ملنا تک پسند نہ کیا بلکہ شدت جذبات سے مجبور ہو کر اپنی تالیف فہرس التوالیف میں فیضی کی نسبت لکھا

" فیضی اگرچہ در فصاحت و بلاغت و متانت و رصانتِ سخن ممتاز روزگار بود،
ولیکن حیف کہ بہ جہت وقوع و ہبوط در ہاویۂ کفر و ضلالت رقم انکار و ادبار بر ناصیۂ
احوالِ خود کشیدہ زبان اہلِ دین و تتمۂ جناب نوشتہ را از بردنِ نام وے و نام جماعتِ
شوم بیجے باک است۔ تاب اللّٰہ علیہم ان کانوا مومنین "

معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بدایونی نے فیضی کی وفات کا واقعہ نہایت اہانت آمیز طریقہ سے بیان کیا ہے لکھتے ہیں کہ مرتے وقت فیضی کتے کی طرح بھونکتا تھا اور اس کا مونہہ سیاہ ہو گیا تھا۔ پھر بہت سی تاریخ ہائے وفات نقل کی ہیں جن کے مصنفین کے نام نہیں بتلائے اس میں فیضی کو ملحد۔ بے دین۔ کتا۔ سگ پرست۔ طبیعی۔ دہریہ اور کیا کیا کچھ قرار دیا گیا ہے مثلاً تاریخ ہائے ذیل:۔

۱۔ بود فیضی ملحدی   ۲۔ قاعدہ الحاد شکست۔

۳۔ وے فلسفی و شیعی و طبیعی و دہری۔

۴۔ فیضیِ بے دین چو مُرد سال وفاتش فصیح
گفت سگے از جہاں رفتہ بحالِ قبیح

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ الزامات کس حد تک درست تھے اور آیا فیضی واقعی ملحد یا بے دین یا دہریہ تھا آئیے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے اُس کی نجی زندگی کا مطالعہ کریں۔ نیز اس کے کلام سے ایسا مواد تلاش کریں جو مطلوبہ فیصلہ کرنے میں مدد دے سکے۔

اسلام کی بنیاد توحید باری تعالےٰ کے عقیدہ پر ہے۔ یہ وہ سنگ ہے جس پر ایمان کی عمارت تعمیر ہوتی ہے فیضی کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے جس میں خدا سے خطاب ہے کہ اے باری تعالیٰ ہم آسمان و زمین کی نسبت سبھی کچھ جانتے ہیں لیکن خواہ ہم اٹھارہ ہزار جہانوں اور ان سے متعلقہ تمام چیزوں کا علم بھی رکھتے ہوں اگر تجھ سے

دُور رہیں تو ہمارا سب علم بے کار ہے۔

آں نیست کہ ما ارض و سما نشناسیم   سرّ قدر و راز قضا نشناسیم

ایں ہژدہ ہزار عالم و آنچہ در وست   نشناختہ بہ اگر ترا نشناسیم

کیا اس کلام سے فیضی کی خداپرستی آشکار نہیں ہوتی۔ وہ صرف خدا کی وحدانیت اور عظمت ہی کا اقرار نہیں کرتا خدا کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے اور اس کی رضا پر راضی رہنے کو اپنا ایمان سمجھتا ہے وہ قضا و قدر کا قائل ہے۔ حالانکہ یہ زمانہ وہ تھا کہ دربار اکبری کے اندر اور باہر مذہب کی ہر بات عقل کے ترازو میں تولی جاتی تھی۔ اور ایمان و ایقان کی بجائے دلیل و برہان کار فرما تھی۔ مگر فیضی باوجود فلسفی ہونے کے عقل کی رہنمائی قبول کرنے کے بجائے خالق کی مرضی کا طالب ہے وہ خالق دوجہاں کی بارگاہِ اقدس میں عرض کرتا ہے

یارب ز کرم امید بے بیم دہ   علمے کہ رضائے تست تعلیم دہ

تاریکی عقل در کشاکش دارد   از شمع رضا فروغ تسلیم دہ

فیضی کو احساس تھا کہ دین کے معاملے میں زمانے کی روش کے ساتھ جو بے راہ روی اس سے سرزد ہو رہی ہے قیامت کے روز اس کے لئے باز پرس ہوگی روزِ جزا پر اسے ایمان ہے۔ دیکھیے اعتاب سے بچائے جانے اور سایۂ رحمت میں لئے جانے کے لئے کس خوبصورتی اور اخلاص مندی سے اپنی گنہگاری کا اعتراف کرکے بخشش کی درخواست کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ الاعمال بالنیات اصول برحق ہے۔

یارب! من اگر مست و گر ہشیارم   گر خفتہ غفلتم و گر بیدارم

ہنگام جزا چو با تو افتد کارم   بر نیت من بہ بین نہ بر کردارم

وقت کی مذہبی تحریکوں کے بالواسطہ اثرات کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اکبری دور میں بہت سے لوگ اس گمراہی میں مبتلا ہو گئے کہ ایمان کی تکمیل صرف توحید پر اعتقاد رکھنے سے ہو جاتی ہے پیغمبر صلعم کی رسالت اور شریعت کا اقرار ایمان کا لازمی جزو نہیں (بحوالہ حیات عبدالحق محدث از نظامی) فیضی پر ان خیالات کا مطلق اثر نہیں ہے بلکہ اس کے علی الرغم وہ پیغمبر صلعم کے مقام و مرتبہ کا پورا پورا احترام بجا لاتا ہے اور آپ کی شان و عظمت کا معترف ہے۔ نیز وہ صحابہ کرام کی پیروی پر نازاں ہے ایک قصیدے میں کہتا ہے :-

ما طائر قدسیم نوا را نشناسیم   مرغ ملکوتیم ہوا را نشناسیم

در کشف حقایق سبق آموز ضمیریم   ترتیب دلیل حکما را نشناسیم

بردانش ما انجم و افلاک بخندند   گر صاحب لولاک لما را نشناسیم

صد شکر کہ ما پیرو اصحاب رسولیم   در شرح دگر راہ نما را نشناسیم

وہ رسول صلعم کے معجزات پر بھی صدق دل سے ایمان رکھتا ہے۔ اس کی ایک رباعی ہے ۔

سلطان رسل ، ماہ عجم ، شاہ عرب — سنگ در او قبلہ گہ اہل طرب
از تابش قہر او کہ دشمن سوزاست — گر سنگ شود موم عجب نیست عجب

دین الٰہی کے تعلق سے اکبر نے باقاعدہ نبوت کا دعویٰ تو نہ کیا لیکن اس نے جو حیثیت اختیار کر لی تھی وہ نبوت سے کم نہ تھی ملا بدایونی نے لکھا ہے ۔

" ایں ہمہ باعث دعوئ نبوت شد اما نہ لفظ نبوت "

ان حالات میں نبوت اور سلطنت کے متعلق ایک عام بدگمانی اور غلط فہمی پیدا ہو جانا لازمی امر تھا۔ اس زمانے کے ایک شگفتہ مزاج شاعر ملا شیری نے جو پنجاب کا رہنے والا تھا اور اکبری دربار سے تعلق رکھتا تھا اکبر کی اس بوالعجبی کا خوب خاکہ اڑایا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شورش معزاست اگر در خاطر آرد جاہلے — کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زیں بیت بس کز طرفگی — نقل بزم منعم و ورد گدا خواہد شدن
شاہ ما امسال دعوائے نبوت کردہ است — گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

فیضی نے صرف رسول عربی صلعم ہی کو رسول برحق تسلیم کیا اور اس کی شان میں ایک ایسی نعت لکھی جس کی ادبی خوبیوں کی پوری پوری تعریف ممکن نہیں اس میں عقیدت و اخلاص کا بحر بیکراں لہریں لیتا ہے دیکھئے مثنوی نل دمن از فیضی ۔ نعت کا عنوان ہے۔

" احصائے جواہر نعت سید المرسلین و احراز لولوئے ثنائے خاتم النبیین "

اس نعت کے متعلق ناقدین ادب بھی عمدہ رائے رکھتے ہیں۔ محمد حسین اپنی تصنیف " دربار اکبری " میں لکھتے ہیں کہ ۔

" پونے دو سو شعر کی نعت مع کیفیت معراج اس نزاکت اور لطافت اور بلند پردازی کے ساتھ لکھی ہے کہ انشا پردازی اس کے قلم کو سجدہ کرتی ہے "

نعت کے ابتدائیہ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آں مرکز دور ہفت جدول — گرداب یٰسین و موج اول
چابک قدم بساط افلاک — والا گہر محیط لولاک
قدرش بزبانہ ماہ اکلیل — نورش بفلک چراغ و قندیل

واقعۂ معراج رسول صلعم کی نسبت ملا بدایونی نے جو بیان دیا ہے حیرت انگیز ہے مگر اس پر فیضی کا رد عمل خیال افروز ہے۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ دربار میں کلام کھلا فقہی مسائل اور شعائر اسلامی کا مذاق اڑایا جاتا

تھا معراج کو خلاف عقل ثابت کرنے کے لئے اکبر بیٹھے بیٹھے یکایک ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور کہا " این معنی را عقل ہیچگاہ نہ قبول کند کہ شخصے در یک لحظہ بگرانی جسم از خواب بآسمان رود " بقول بدایونی اکبر کو تو واقعہ معراج پر حیرت و استعجاب ہوتا ہے مگر فیضی نے اسے کمال عقیدت کے ساتھ قبول کیا۔ اس نے ۱۸۶ اشعار میں واقعہ معراج کی صداقت و عظمت خلوص سے بیان کی ہے وہ " معراج صعود جسم و جان " کا قائل ہے (دیکھئے مثنوی نل دمن از فیضی) کچھ اشعار یہ ہیں :

سلطان سریر آسمانی ۔۔۔ در خواب بہ قصر ام ہانی
جبرئیل امیں رسید پویاں ۔۔۔ از ایزد پاک مژدہ گویاں
کامشب شب جوش بحر جود است ۔۔۔ معراج صعود جسم و جان است
آورد شگرف مرکبے تند ۔۔۔ با پویۂ او تنگ خرد کند

دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں علمائے ہند کی توجہ زیادہ تر فلسفہ اور علم کلام کی جانب منعطف تھی قرآن اور حدیث کو اس زمانے کے نصاب میں ثانوی حیثیت دی جاتی تھی۔ بدایونی کا بیان تو یہ ہے کہ :

" فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندۂ آں مطعون و مردود و نجوم و حکمت و طب و حساب و شعر و تاریخ و افسانہ رائج و معروض " (منتخب التواریخ ج ۲ : ص ۳۰۲)

فیضی کی پوزیشن یہاں بھی صاف ہے وہ صرف ترتیب دلیل حکما " کا ہی قائل نہیں بلکہ وہ فلاسفہ کے تمام گروہوں اور ان کے سربراہوں کو خدا کے حضور عاجز اور اس کی جستجو میں سرگرداں دیکھتا ہے :

فرقۂ اشراقیاں در عظمت آشفتہ سر ۔۔۔ زمرۂ مشائیاں در رہبت افگار پا
نیست دماغی تہی از سر سودای تو ۔۔۔ مغز فلاطون بسوخت زیں تف مالیخولیا

نظامی صاحب اپنی کتاب " حیات عبدالحق " میں لکھتے ہیں کہ " ان دنوں اگر قرآن و حدیث سے رجوع کیا جاتا تھا تو حیلہ بازی کے جواز کے لئے اور تفسیر لکھی جاتی تھی تو تاویلات کا ایک طوفان برپا کرنے کے لئے (بحوالہ صفحہ ۲۷) فیضی اس روش پر چلنے والوں پر شدید حرف زنی کرتا ہے۔ وہ قرآن کی تعلیم صحیح معنوں میں رائج کرانے کا خواہش مند ہے اور غلط تاویلات کرنے والوں کو تنبیہہ کرتا ہے۔ مثنوی مرکز ادوار میں لکھتا ہے :

معنی قرآن چہ ادا می کنی ۔۔۔ ایں ہمہ تاویل چرا می کنی
حق ز تو با غیر مشابہ شدہ ۔۔۔ پیش تو محکم متشابہ شدہ
فہم تو از قول نبی اجنبی ۔۔۔ بے خبر از سر حدیث نبی
چوں سخن از شرح بہ جج می رود ۔۔۔ فکر تو چوں حاشیہ کج می رود

طعنہ مزن این ہمہ بر اختلاف　　　کز پئے تسہیل تو رفت اختلاف

(بحوالہ مخطوطہ در کتب خانہ شاہی رامپور صفحات ۱۱۶/۱۱۷)

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شیفتی علمائے سُو کی بدعت آفرینیوں اور حبّ جاہ کے جذبات سے واقف نہ تھا یا کہ وہ اُن باتوں کو خاموشی سے برداشت کر جاتا تھا۔ نہیں اُس کا دل اُن لوگوں کی طرف سے زخمی تھا چنانچہ جب بھی موقع ملتا وہ علمائے سُو کی بدعملی کے خلاف دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا اپنے ایک قصیدے میں علمائے متکبرین کی نسبت لکھا ہے:-

زبان کشیدہ بدار القضائے عجب دریا　　　شہود کذب ز دعوی گران ایمانی

اگر حقیقت اسلام در جہاں اینست　　　ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی

وہ وقت کے فقہائے سُو پر کھلم کھلا چوٹ کر جاتا ہے مثنوی مرکز ادوار میں ایک حکایت نقل کرتا ہے کہ صحرا میں کسی عارف نے شیطان کو دیکھا کہ بے فکر بیٹھا ہے اور اپنے کار منصبی یعنی شیطنت پھیلانے سے فراغ پائے ہوئے ہے۔ عارف نے سبب پوچھا تو شیطان نے بیان کیا کہ میں نے اپنی ڈیوٹی اب علمائے وقت کے سپرد کر رکھی ہے جب تک وہ میرا کام انجام دے رہے ہیں مجھے تردد کی ضرورت نہیں۔ موجودہ زمانے کا ایک فقیہہ دونوں جہانوں کی گمراہی کے لئے کافی ہے شیفتی کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

عارفی از شہر بصحرا گذشت　　　دید عزازیل بدامان دشت

دل زغم وسوسہ پرداختہ　　　دیدہ ز نیرنگ تہی ساختہ

گفت بدو عارف صحرا نورد　　　کز چہ دریں بادیہ ہرزہ گرد

طبع تو آسودہ ز وسواس چیست　　　ویں فترت کندی الماس چیست

کار تو در صومعہ و خانقاہ　　　باز چرا ماندہ از کارگاہ

تفرقہ بخش صف طاعت نۂ　　　رخنہ گر سلک جماعت نۂ

در صف اصحاب نہیب تو کو　　　جادوی جبرئیل فریب تو کو

شعبدہ انگیزی غویت کجاست　　　خوی بہ عربدہ جویت کجاست

نیست سر اشتلم آموزیت　　　سرد شد آن گرمی جانسوزیت

رہزن دہقان بدل بدسگال　　　طنز کناں داد جواب سوال

کز برکات علمائے زماں　　　فارغم از کشمکش این و آں

داشت مرا باز ازیں جد و جہد　　　حیلہ گریہای فقیہان عہد

یک تن ازیں طائفہ بوالہوس   از پی گم راہئ کونین بس

حقائق بالا کی روشنی میں فیضی کو اگر ملحد، دہریہ اور بے دین سمجھا جائے تو انصاف سے کوسوں دور ہوگا۔ ان واقعات کو پیش کرنے کے بعد ہمیں ایک بات کہنی ہے اور یہ کہ ہرچند کہ فیضی کا دل نورِ ایمان سے منوّر تھا اور وہ اسلام کی حقیقتوں سے نہ صرف واقف تھا بلکہ پوری طرح قائل اور معتقد تھا۔ پھر بھی ہم اسے قطعی طور پر معصوم قرار نہیں دے سکتے۔ خود ایک بڑا عالم ہونے اور ایک جید عالم دین کا بیٹا ہونے کی بناء پر صحیح اسلامی عقائد کی اعلانیہ تبلیغ اس کے ذمہ تھی جسے وہ مصاحبتِ شاہ کے دباؤ اور اپنی مصلحت کوشی کے باعث ادا کرنے سے قاصر رہا۔ یہ کام قدرت نے حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لیا۔ جنہوں نے علی الاعلان اسلام کی حقیقت پیش کی اور لوگوں کو گمراہی سے بچا لیا

اوپر کے بیانات سے ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ فیضی ملحد، بے دین یا دہریہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک موحد اور مسلمان تھا۔ اب ہمیں یہ بتلانا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کا تعلق اسلام کے کس فرقے سے تھا۔ نیز اس کی زندگی کے دوران اس کے مذہبی عقائد میں کیا کیا تغیرات واقع ہوتے رہے اور کن حالات کے زیر اثر۔ یہ بحث تفصیل طلب اور اس کے لئے ہمیں فیضی کی شروع سے آخر تک کی زندگی کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

فیضی کے خیالات ہمیشہ باپ کے زیر اثر پروان چڑھے وہ بچپن سے اپنے والد شیخ مبارک کی نگرانی میں رہا۔ جو زمانے کے مانے ہوئے عالم دین تھے۔ انہوں نے قرآن شریف کی ایک مبسوط تفسیر "منبع العیون" کے نام سے چار جلدوں میں لکھی۔ انہوں نے بیٹے کی تعلیم و تربیت خود کی۔ ظاہر ہے کہ فیضی کو اوائل عمر ہی سے دین سے وابستگی ہو گئی تھی۔ اور وہ اسلامی ماحول میں بڑا ہوا۔

فیضی کی زندگی کا سب سے پہلا واقعہ جس سے اس کے دینی عقائد اور اس کی فرقہ پرستی کا راز کھلتا ہے وہ ہے جب کہ عالم جوانی میں وہ اپنے باپ کے ہمراہ شیخ عبدالنبی صدر اسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور ایک سو بیگھہ اراضی لبطور مدد معاش کے لئے درخواست گذرانی۔ وقت کے آئین کے مطابق باپ بیٹے دونوں کو ایسی سرکاری امداد کا استحقاق حاصل تھا۔ مگر صدرِ اسلام نے نہ صرف یہ کہ فیضی کی درخواست نامنظور کر دی بلکہ باپ بیٹوں کو بڑی حقارت سے اپنی بارگاہ سے نکلوا دیا۔ الزام یہ دیا کہ یہ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن دِنوں دربار اکبری میں تورانیوں کو اقتدار حاصل تھا اور شیعہ حضرات معتوب تھے۔

فیضی یا اس کے باپ نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اس کے برعکس

وہ آئندہ سُنّی علما سے انتقام لینے کی تجاویز سوچتے رہے۔ اس واقعہ کے علاوہ فیضی کی تصانیف سے بھی آشکارا ہوتا ہے کہ وہ شیعہ عقائد کا پیرو اور فرقۂ اثنا عشریہ کے بارہ اماموں کا عقیدت مند تھا۔ اشعار ذیل سے یہ معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

با مشعل خورشید اگر گرم بگردیم — بی نورِ علیؑ راہِ علا را نشناسیم
از کحل یقین دیدۂ ما گر بکشایند — بی خاک رہش کشف غطا را نشناسیم
بی نورِ بمیریم بظلمت کدۂ کفر — گر آن دو چراغ شہدا را نشناسیم
باقرؑ کہ دلش بارقۂ عالم غیب است — بی برق تولایش ضیا را نشناسیم
صادقؑ نفسانیم کہ بی طلعت صادق — در صبح دم صدق جلا را نشناسیم
کاظمؑ کہ بود ناظم دیوان ولایت — بی دوستیش ستر ولا را نشناسیم
ابلیس زما نسخۂ تعلیم بگیرد — در عشق اگر راہ رضا را نشناسیم
گر دین تقیؑ را و نقیؑ را نگزینیم — ارباب نقیؑ و تقیؑ را نشناسیم
از نفس ہزیمت بخوریم ار بحقیقت — سرلشکرِ میدان غزا را نشناسیم
فیضی نشود خاتمۂ ما بہدایت — گر ختم امامان ہدیٰ را نشناسیم

اس کلام سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بدایونی نے جو یہ کہا کہ فیضی اہلِ اسلام سے عداوت۔ دین کے اصولوں پر طعن۔ صحابۂ کرام۔ تابعین مشائخ وغیرہ کی مذمت اور اہانت کرتا تھا قطعاً غلط ہے۔ بلکہ فیضی کے دل میں بزرگانِ دین کی عزت و توقیر ہے۔

صد شکر کہ ما پیروِ اصحاب رسولیم — در شرح دگر راہنما را نشناسیم
در قافلۂ دین کہ شود بدرقۂ ما — گر پیشروِ صدق و صفا را نشناسیم
بر دانشِ ما انجم و افلاک بخندند — گر صاحب لولاک لما را نشناسیم
فردائے قیامت بہ پناہ کہ گریزیم — گر آل شہِ خورشید لوا را نشناسیم

دوسرا واقعہ جس سے فیضی کو مذہبی تعصب کی بنا پر مبتلائے مصائب ہونا پڑا ۹۶۷ھ کا ہے جب کہ اس کے والد شیخ مبارک پر مہدویت کا الزام لگایا گیا اور شیخ مبارک کو اپنے دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کو لے کر روپوش ہونا پڑا۔ اس دوران انہوں نے بے حد مصائب برداشت کیے۔ لیکن کوئی شہادت یہ ثابت کرنے کے لیے نہیں ملتی کہ فیضی نے بھی مہدویت میں دلچسپی لی ہو۔ حقیقت کچھ بھی ہو فیضی کو دربارِ اکبری کے سُنّی علما کے ہاتھوں زبردست زک اٹھانی پڑی۔

تیسرا واقعہ جو نوعیت کے اعتبار سے اوپر کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے وہ یہ ہے کہ ۹۷۵ھ میں جب اکبر نے چتوڑ کے مقام سے فیضی کی طلبی کا فرمان حاکم آگرہ کے نام بھیجا تو علمائے دربار نے حاکم آگرہ کو اکسایا جس پر اُس نے فیضی کے لئے پریشانیاں پیدا کر دیں۔ چنانچہ مغل سپاہی فیضی کو ایک ملزم کے طور پر آگرہ سے چتوڑ لے چلے۔ اس وقت فیضی بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ شائد بادشاہ نے اس کے مذہبی عقائد سے بدظن ہو کر طلبی کا فرمان بھیجا ہے۔ چنانچہ اکبر کے روبرو پیش ہونے پر فیضی نے جو قصیدہ پڑھا اس میں اپنے تذبذب کا اظہار بھی کیا ہے یوں طور :

ازاں زماں کہ نویسم کہ بُود بے آرام — سفینۂ دلم از موج خیز طوفانی

گہے چو دہم مراسمہ کز کدام دلیل — برم ظنون و شکوک از علوم ایقانی

چرا بُود متخالف رسوم اسلامی! — چرا بُود متشابہ حروف فرقانی

اکبر کے دربار میں رہتے ہوئے فیضی پختہ عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ اب اس کے ذہن میں فلسفہ کی باریکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ہر بات حتیٰ کہ دین کی حقیقت بھی جستجو سے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہ تقلید سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایک رباعی میں دعا کرتا ہے :

یارب قدمے براہِ توحیدم دہ — شوقے بہ نہاں خانۂ تجریدم دہ

دل بستگی بستر تحقیقم بخش — آزاد کنی ز قید تقلیدم دہ

فلسفہ میں زیادہ دسترس حاصل ہونے پر فیضی نے دین کو عقلیت کے ترازو میں تولنا شروع کر دیا۔ اس اندازِ فکر میں اس کا بھائی ابوالفضل اور والد شیخ مبارک بھی شامل تھے۔ عبادت خانہ کے جلسوں میں جو مباحثے ہوتے ان میں فیضی اور ابوالفضل عقلی دلائل کے زور سے علماء کو شکستیں دیتے۔ ان کے دلائل کا یہ اثر ہوا کہ اکبر کے دل میں سے علماء اسلام کی وقعت جاتی رہی۔

۹۸۷ھ میں شیخ مبارک نے اپنے بیٹوں کے مشورہ سے عہدِ اکبری کی مشہور دستاویز (محضر نامہ) تیار کی جس کا مقصد علمائے دربار کا زور توڑنا اور دینی امور میں بھی بادشاہ کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا۔ اس کے مرتب کرنے میں اسلام سے انحراف روا نہیں رکھا بلکہ اس کے برعکس اس میں جو استدلال کیا گیا اس کی بنیاد قرآن و حدیث پر رکھی۔ چنانچہ یہ نصِ قرآنی بنیادی اصول قرار دی گئی۔

" اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم "

اور ان حدیثوں سے مزید تقویت بہم پہنچائی :

ا۔ اِنَّ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَی اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِمَامٌ عَادِلٌ

۲۔ مَن یّطع الأمیرَ فَقَد اَطَاعَنی وَمَن یَعصِ الامیر فقد عصانی

اس دستاویز کے نفاذ سے علماء دربار کے نفاذ سے علماء دربار کے اختیارات پر ضرب کاری لگی اور وہ شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں کے سخت درپے آزار ہو گئے۔ ان پر لامذہبی اور الحاد کا الزام دھرا۔ بدایونی بھی ان علماء کا ہمنوا ہو گیا۔ اس دستاویز میں تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے کفر لازم آتا ہے زیادہ سے زیادہ اسے ایک بدعت کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال فیضی نے آخر زندگی تک توحید پرستی کے عقائد میں تزلزل نہیں آنے دیا۔

۹۸۷ء میں جب اکبر بادشاہ نے امام عادل بن کر جامع مسجد فتح پور سیکری میں برسر منبر خطبہ دینا چاہا تو اس کے لئے فیضی نے یہ شعر مرتب کر کے دیئے جن میں سب قوتوں اور نعمتوں کا منبع اللہ تعالےٰ ہی کو تسلیم کیا ہے۔ بادشاہت دینے والا بھی وہی ہے:

خداوندے کہ مارا خسروی داد   دلِ دانا و بازوے قوی داد
بعدل و داد مارا رہنموں کرد   بجز عدل از خیالِ ما برون کرد
بود وصفش زحدِ فہم برتر   تعالےٰ شانہٗ اللہ اکبر

فیضی کو اپنی عمر کی چوتھی دہائی کے خاتمہ کے قریب دربار شاہی میں بے حد رسوخ حاصل ہو چکا تھا۔ وہ اکبر کا گہرا دوست بن چکا تھا۔ اس نے بہت سے علماء فضلاء سے بھی دوستی پیدا کی اور ان کے نام خط لکھے۔ ان خطوں میں دل کا ماجرا لکھا۔ فیضی کے خطوط کا مجموعہ "لطیفۂ فیاضی" کے نام سے میں نے مدوّن کیا ہے۔ اس میں متعدد خطوط ہیں جن میں ذیل کے بزرگوں سے اظہار عقیدت کیا گیا ہے:
شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ خواجہ معین الدین محمد الہاشمی مکیؒ۔ مولانا شیخ جمال ٹلوی۔ مولانا عبداللطیف دکنی مولانا کمال الدین حسین شیرازی، مولانا غوثی منڈوی۔ شیخ حسن کالپی وال۔ ان خطوط سے بدایونی کے ان دیمارکس کی مزید تکذیب ہوتی ہے کہ فیضی بزرگان دین اور صالحین کی تضحیک کرتا تھا۔ (دیکھئے منتخب التواریخ ج ۳: ص ۲۹۹)

سب سے بڑا واقعہ جس نے فیضی کی مذہبی زندگی پر بھاری اثر ڈالا ۹۸۹ھ میں اکبر کے قائم کردہ مبینہ دین الٰہی کی ترویج تھی۔ فیضی اس تحریک کا سرگرم رکن بنا۔ اس تحریک میں جو لوگ اہمیت رکھتے تھے انہیں بادشاہت کے لئے اپنی جان، مال، آبرو اور مذہب کی قربانی دینے کا اقرار کرنا ہوتا تھا اس مرحلہ پر سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا فیضی نے اکبر کا مبینہ دین قبول کر کے دین اسلام سے انحراف کر لیا۔ دین الٰہی کو اوّل تو عام معنوں میں دین کہا نہیں جا سکتا بلکہ یہ ایک قسم کی صوفیانہ تحریک

تھی جس میں بہت سے مذہبوں سے اصول منتخب کر کے جمع کر دیے گئے تھے۔ اسے اکبر کا ایک مشغلہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اگر اکبر سنجیدگی سے کسی دین کو رائج کر کے نافذ کرنا چاہتا تو یہ صورت نہ ہوتی کہ ملک بھر میں فقط گنتی کے آدمی اس میں شامل ہوتے۔ حکومت کے وفادار ملازمین اس تحریک میں شامل ہو کر اکبر کے چیلے کہلاتے تھے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ دین الٰہی کی تحریک میں شامل ہونے والوں کے لئے یہ لازم نہیں تھا کہ وہ اپنے سابقہ مذہب کو خیرباد کہہ دیں بلکہ وہ اپنے اصلی دین پر قائم رہتے ہوئے بھی دین الٰہی کا رکن بن سکتے تھے۔ مثلاً صدر جہاں کو داڑھی رکھنے کی اجازت دی گئی تھی، حالانکہ دوسرے اراکین داڑھی منڈواتے تھے۔

بات میں کچھ پیچ ضرور پڑ جاتا ہے جب ہم فیضی کے ان اشعار کو دیکھتے ہیں جو اس نے ان دنوں دین الٰہی کے زیر اثر ہو کر اکبر کی حمایت اور اس کے عقائد کی تائید میں لکھے اور ان کے مطالب صریحاً دین اسلام کے منافی تھے مثلاً:

خواہی کہ چو من راہِ ہدیٰ بشناسی ‏ ‏ ‏ نشناختہ شاہ را کجا بشناسی
این سجدۂ نا قبول سودت ندہد ‏ ‏ ‏ اکبر بشناس تا خدا بشناسی

اور:

چوں شاہ فلک قدر بہنگام سحر ‏ ‏ ‏ از صدق کند بسوی خورشید نظر
رو مصحف توحید کشاید اخلاص ‏ ‏ ‏ ہذا ربّی بخوان و ہذا اکبر

ایسی ہی باتوں سے فیضی کو ملحد کہا گیا اور اسے بادشاہ کو اسلام سے منحرف کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ بشیر خان لودھی اپنے تذکرہ مراۃ الخیال میں لکھتے ہیں:

"(اکبر بادشاہ) در مدت قلیل تمامی ہندوستان را باکثرے از توابع بنگالہ و دکن بحوزۂ تسخیر درآورد ولیکن ابوالفضل و فیضی کہ دہریہ مشرب و سرِ حلقۂ اہلِ زندقہ بودند در صحبت خاص راہ یافتہ و تیرہ صفاتہ دائی خاطر پادشاہ را از جادۂ مستقیم انحراف دادند ...... تا کار بجائے رسید کہ بادای بعضی از رسوم اہلِ ہند پرداخت و این دو بیت فیضی از قصیدۂ مدح پادشاہ بر آں گواہ است۔

قسمت نگر کہ در عدد ہر جوہر کا عطاست ‏ ‏ ‏ آئینہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او میکند معائنہ خود در آئینہ ‏ ‏ ‏ این میکند مشاہدۂ حق در آفتاب

و این ابیات اکثرے از ہنود دستاویز آفتاب پرستی ساختہ بمدح فیضی رطب اللسان اند۔ چوں مردم دہریہ را اعتقاد نیست بلکہ صانع نیز در نظر نیست، ہموارہ در تیۂ اباحت بسر می برند و از اہل کار غافل بودہ اولاً خود را و ثانیاً دیگران را در وادیۂ ضلالت مستہلک سازند"

اس زمانے میں دربار اکبری میں مذہب اسلام کی جو حالت ہوئی اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ اکبر کو خوش کرنے کے لئے علمائے سو نے طرح طرح کی بدعتوں سے اسلام کو روشناس کیا۔ بدایونی نے ان تمام بدعتوں کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے اور ان کے بانیوں کا نام بھی لیا ہے۔ مگر مزہ یہ ہے کہ انہوں نے کوئی بدعت فیضی سے منسوب نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ اگر فیضی نے اکبر کو کسی بدعت کی ترغیب دلائی ہوتی تو بدایونی فیضی کو کسی صورت معاف نہ کرتا۔ اکبر کی ذہانت سیاسی امور میں مسلم ہے۔ وہ اپنی مذہبی پالیسی کا بنانے والا آپ ہے۔ فیضی کا اس کے مزاج پر اس قدر قابو اور تصرف ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ اس کے عقائد بدل دے یقیناً فیضی کی اہمیت جتانے میں بھاری مبالغہ کرنا ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فیضی جیسا مصلحت کوش شخص اکبر کی تحریک کی کان نمک میں داخل ہو کر نمک ہوا۔

چالیس سال کی عمر گزارنے کے بعد فیضی کے خیالات میں زیادہ پختگی اور گہرائی آجاتی ہے۔ اس کا ذہن فلسفیانہ انداز پر سوچتا ہے۔ وہ دین کے تعلقات سے اپنے آپ کو بری خیال کرتا ہے نیز ایرانی وضع کے اسلام کے مقابلے میں حکیمانہ اسلام کا قائل نظر آتا ہے۔ وہ معاملہ کی حقیقت تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ مذہب کے ظاہری تعلقات سے کنارہ کش ہو کر مذہب کی روح کا دامن گیر ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک عارف کا بہشت و دوزخ فقط اس کی حالت بسط و قبض کا نام ہے۔

ایا محیطِ مواعظ کمالِ ملت و دین — دریغ گوہرِ وعظ ترا مصارف نیست
بہ پیش من سخن از دوزخ و بہشت مگو — کہ گوشِ ہوش حریفان بدین زخارف نیست
عذائے راز من احوال حشر و نشر مپرس — کہ سادہ لوحِ تحفت الوالعارف نیست
غلام حوصلۂ حافظم کہ می گوید — بہشت و دوزخ جز بسط و قبضِ عارف نیست

مذہب کے معاملہ میں فیضی کی فلسفیانہ موشگافیوں اور دین الٰہی کے زیر اثر بے راہ روی پر اس کے دلی دوست تک اس سے بدظن ہو گئے۔ ان میں سے ایک عبدالحق محدث دہلوی تھے جن کی نسبت پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ مگر فیضی فلسفہ و عقلیت کی زد میں تھا۔

فیضی کی زندگی کے خاتمے سے دو سال قبل جبکہ وہ دکن کی سفارت سے واپس آیا۔ اس کے دینی خیالات میں ایک اور تغیر واقع ہوا۔ اس نے جان لیا کہ عقل خواہ کتنی ہی بالا کیوں نہ ہو جائے دین کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور وہ بے بس ہے۔

چندانکہ بعقل گیر و دار است مرا — صد گونہ گرہ بکار و بار است مرا
اے عقل برو کہ از تو کارم نشود! — دے بخت نبی کہ با تو کار است مرا

اس نے خدا سے التجا کی کہ اسے عقل کی تاریکی سے پیدا شدہ کش مکش سے نجات دے اور اپنی رضا کی راہ پر لگائے۔

یارب ز کرم امید بے بیم دہ   عمی کہ رضائے تست تعلیم دہ
تاریکیٔ عقل در کشاکش دارد   از شمع رضا فروغ تسلیم دہ

وفات سے کچھ مدت پہلے فیضی نے اپنی مثنوی مرکز ادوار مکمل کی جس میں مذہب اور فلسفہ کا ایک عمدہ امتزاج پیش کیا۔ ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ میں فیضی نے عوام کے خیالات پر اپنی دینداری کی مہر ثبت کر دی جب کہ اس نے قرآن مجید کی عربی زبان اور بے نقط الفاظ میں تفسیر مکمل کر دی۔ اس تفسیر سے فیضی کی عالمانہ شان کا اظہار ہوتا ہے ایسی ہی تالیفات کی بنا پر علامہ شبلی نے فیضی کو "ملائے سعدی" کے خطاب سے نوازا ہے۔

وفات سے پہلے فیضی کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ دنیاوی مصلحتوں کے زیر اثر اپنی دینی بے راہ روی پر اظہار تاسف کرتا ہے اور اللہ کے حضور استغفار کرتا ہے۔ اسے تسلی ہے کہ اس کی نیت نیک تھی۔

یارب! من اگر مست دگر ہشیارم   گر خفتۂ غفلتم دگر بیدارم
ہنگام جزا چو با تو افتد کارم   بر نیت من بہ بین نہ بر کردارم

آخر میں ہم فیضی کے ناقدین سے اس کی بریت کے لئے درخواست کرتے ہیں اور فیضی کے ہی اشعار ذیل اپنے منشائے دلی کے اظہار کے لئے پیش کر کے فیضی کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

فیضی چو شنیدی از یکے بد
زنہار کہ بدگوئی دے را
در گوش یقین کشاد بشنو
ظنوا بالمومنین خیرا

نوٹ:۔ محترم ڈاکٹر اے ڈی ارشد صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی پروفیسر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور نے اپنا یہ مقالہ بزم فارسی تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے ایک اجلاس میں خود پڑھ کر سنایا تھا۔ ادارہ محترم ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہے کہ قارئین کے استفادہ کے لئے آپ نے اس مقالہ کو المنار میں شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(ادارہ)

داؤد طاہر

چند لمحے ٹیکسلا میوزیم میں!

آج کا انسان اس امر کا مدعی ہے کہ تہذیب و تمدن میں اس نے وہ کمال حاصل کر لیا ہے جس کا حصول قدیم انسان کے لئے ایک سہانے خواب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا اور عین ممکن ہے کہ اس عروج کا تصور بھی کبھی ان کے ذہن میں نہ آیا ہو۔ اس دور میں اشرف المخلوقات نے زندگی کے ہر پہلو میں گراں بہا ترقیات حاصل کر لی ہیں اور بلحاظ ترقی تہذیب موجودہ اور قدیم دور میں وہی نسبت ہے جو سورج کو چراغ سے۔ اگر کبھی وقت تھا ہی درختوں کی شاخوں۔ بوسیدہ سی جھونپڑیوں اور کچے مکانات کو انسان رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا تو آج بیسیوں منزلہ عظیم الشان سر بفلک عمارات اس کا مسکن ہیں۔ اگر گذشتہ زمانہ میں درختوں کے پتے اور دستی کھڈیوں سے تیار شدہ موٹا کھدر اس کے تن کو ڈھانپتا تھا تو آج نہایت ہی عمدہ سوتی اور ریشمی کپڑے اس کے جسم کو زینت دینے کے لئے دنیا کے کسی بھی گوشے میں مہیا ہو سکتے ہیں۔ اگر چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے لئے درکار ہوتی تھیں تو آج اس سے ہزاروں گنا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ اگر از منہ قدیم میں گھوڑے، خچر، گدھے اور اونٹ ہی ایک سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا سب سے بہترین ذریعہ تھے تو آج بسوں، موٹروں اور جیٹس (JETS) نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ اور اگر پرانی جنگیں تیر کمان، نیزہ تلوار اور گھوڑے ہاتھی کے استعمال تک ہی محدود تھیں تو آج ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور ان سے بھی بڑھ کر مہلک ہتھیاروں سے آن کی آن میں دنیا کو تباہ کر دینے کی دھمکیاں ایک دوسرے کو دی جا رہی ہیں۔

گو یہ سب باتیں جدید انسان کو قدیم انسان سے بہت افضل و اعلیٰ، بلند اور ترقی یافتہ قرار دینے کے لئے بہت کافی ہیں لیکن ان سب حقائق کے باوجود گذشتہ زمانہ کے انسان کو وہ حیثیت دینا جو ہم لیے اہم دے رہے ہیں۔ اس سے سراسر ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ کھنڈرات اور آثار قدیمہ ہیں جن میں سے بیشتر کی کھدائی اس صدی میں ہوئی ——— پاکستان میں ان آثار قدیمہ میں سے موہنجو داڑو، المنصورہ، ٹھٹھہ، ہڑپہ، اور ٹیکسلا وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے اندر تاریخ کا ایک قدیم

اور عظیم باب سمیٹے ہوئے ہے۔

ٹیکسلا کی کھدائی ۱۹۱۳ء میں محکمہ آثار قدیمہ کے اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل۔ سر جان مارشل کی زیر نگرانی شروع ہوئی۔ اور اکیس سال کے طویل عرصہ، یعنی ۱۹۳۴ء تک جاری رہی اس کھدائی کے نتیجہ میں تین شہروں اور دو درجن سے زائد سٹوپے (STUPAS) اور خانقاہوں کے آثار برآمد ہوئے۔

شہروں میں سے قدیم ترین شہر بھیڑ ماؤنڈ (BHIR MOUND) ہے جو ایک مختصر سی سطح مرتفع پر واقع ہے۔ یہ شہر چھ سو قبل مسیح سے دو سو قبل مسیح تک آباد رہا۔ دوسرے نمبر پہ سرکپ (SIRKAP) آتا ہے تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سرکپ دوسری صدی مسیحی تک آباد رہا یہ شہر بھیڑ ماؤنڈ سے شمال مشرق میں ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ تیسرا شہر سرسکھ (SIRSUKH) ہے جو پانچویں صدی عیسوی کے پہلے نصف تک آباد رہا اور آخر کار سفید ہنوں (WHITE HUNS) کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہوا۔[1]

ان شہروں کے علاوہ جو مختلف سٹوپے یا دوسرے آثار ملے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔

دھرماراجیکا سٹوپا (THE DHARMARAJIKA STUPA): یہ پہلی سے پانچویں صدی عیسوی تک آباد رہا۔ یہ وادی ٹیکسلا کے جنوبی نصف حصہ میں واقع ہے۔ اس میں سے پتھر اور چونے، مٹی سے تیار شدہ بہت سے بت، کتبے اور سکے وغیرہ دستیاب ہوئے ہیں۔

جنڈیال مندر (THE JUNDIAL TEMPLE): یہ مندر آتش پرستی کے لئے مخصوص تھا۔ اس کی جائے وقوع سرکپ شہر کے شمالی گیٹ کے سامنے ہے غالباً اس کی تعمیر یونانیوں کی جنہوں نے اس جگہ آنے سے قبل مجوسیت قبول کر لی تھی۔ اس کے قریب ہی مغربی جانب تین بدھ مندر اور خانقاہیں بھی ہیں۔

موہڑا مرادو سٹوپا اور خانقاہ (MOHRA MURADU STUPA AND MONASTERY) شواہد سے پتہ چلتا ہے اس کی تعمیر دوسری صدی میں ہوئی اور یہ پانچویں صدی عیسوی تک آباد رہا اور اب بھی موہڑا مراد گاؤں کے پیچھے ٹیکسلا عجائب گھر سے تقریباً ساڑھے تین میل دور ایک تنگ سی وادی میں واقع ہے۔ ان کھنڈرات سے اُس زمانہ کے بنے ہوئے پتھر اور چونے کے بہت سے بت حاصل ہوئے ہیں۔

اس جگہ کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ وہ واحد سٹوپا جو ہر لحاظ سے مکمل حالت میں ملا ہے۔ اسی جگہ ہے۔

جولیاں (JOLLIAN STUPA AND MONASTERY): دوسری تا پانچویں صدی مسیحی

---

[1] بھیڑ ماؤنڈ سرکپ اور سرسکھ موجودہ نام ہیں ان کا قدیم اور اصل نام تکشا شلا یا تکاسلا تھا۔

یہ خانقاہ خاصی اچھی حالت میں برآمد ہوئی ہے اور اس میں بہت سے سٹوپے ہیں یہ سطح زمین سے ۳۰۰ فٹ کی بلندی پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے۔ اور میوزیم سے تقریباً ۲½ میل دور ہے۔ اس میں چونے سے تیار شدہ بہت سی مورتیاں ہیں جو ان سٹوپوں کی زینت ہیں۔

کلاواں KALAWAN STUPA AND MONASTERY: (پہلی تا پانچویں صدی عیسوی) اس کی جائے وقوع مارگلہ رینج (MARGALA RANGE) کی شمالی ڈھلان پر دھرمارا جیکا سٹوپا کے جنوب کی طرف ہے۔ خانقاہوں کے اس مجموعہ سے چونا اور پختہ مٹی سے بنے ہوئے بت ملے ہیں جو اپنی ساخت میں وادی کی دوسری جگہوں سے دستیاب ہونے والے بتوں سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

ٹیکسلا کی کھدائی کے دوران یہ کھنڈرات بھی دریافت ہوئے ہیں:۔

گری (GIRI)، بھمالا (BHAMOLA)، بادل پور (BADAL PUR)، رتّا پنڈ (RATTAPIND) لال چک (LAL CHAK)، بجراں (BAJRAN)، بھلّر توپ (BHALAR TOPE) کنالا سٹوپا اور خانقاہ (KUNALA STUPA AND MONASTERY) خادر محیڑا اور اکھوڑی (KHADAR, MOHRA & AKHORI) ان میں سے بیشتر دوسری صدی سے پانچویں صدی عیسوی تک آباد رہے۔[1]

٥

ٹیکسلا میوزیم ٹیکسلا ریلوے سٹیشن سے بالکل قریب ہی زیادہ سے زیادہ چند فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے سٹیشن سے ایک سیدھی پختہ سڑک آپ کو میوزیم تک لے جائے گی۔ پاس ہی یوتھ ہاسٹل ہے جہاں طلباء اور سیاح وغیرہ قیام کر سکتے ہیں۔

لیجئے اب ہم میوزیم کے لغیر تختوں کے گیٹ سے اندر آ چکے ہیں۔ گیٹ کے پاس ہی بائیں ہاتھ ایک چبوترے پر چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بڑے خوبصورت انداز میں "TAXILA MUSEUM" کے الفاظ تحریر ہیں۔ اصل عمارت کے دروازہ میں داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جہاں سے ہم میوزیم یا کھنڈرات دیکھنے کے لئے ٹکٹ حاصل کرتے۔ شرح ٹکٹ بارہ نئے پیسے ہے ——— اس کمرہ کی سامنے والی دیوار پر بائیں طرف سنگ مرمر کی ایک تختی پہ یہ الفاظ کندہ ہیں: "یہ پتھر ہز ایکسی لینسی لارڈ چیمسفورڈ وائسرے و گورنر جنرل ہندوستان کے ہاتھوں ۲ نومبر ۱۹۱۸ء کو نصب ہوا"۔ دائیں طرف ٹیکسلا کی کھدائی کرنے والے

---

[1] ماخوذ از A SHORT HISTORY OF THE REMAINS AT TAXILA

ماہر آثار قدیمہ سر جان مارشل کی یاد میں اسی قسم کی ایک تختی نصب ہے لکھا ہے: "سر جان مارشل (۱۸۷۶ء تا ۱۹۵۸ء) کی یاد میں، انہوں نے ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک ٹیکسلا کی کھدائی کی۔" ساتھ ہی ایک شوکیس میں محکمہ آثارِ قدیمہ حکومتِ پاکستان کی مطبوعات برائے فروخت موجود ہیں جن میں کتب کے علاوہ متعلقہ پکچر پوسٹ کارڈز اور موہن جوداڑو سے برآمد ہونے والی مہروں کی نقول بھی شامل ہیں

اسی کمرہ کا ایک دروازہ اس عظیم ہال میں کھلتا ہے جو عجائب گھر کی اصل عمارت ہے —— اندر داخل ہوتے ہی انسان عجیب قسم کے خیالات میں کھو جاتا ہے اور یہ بات سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کیا وہ اسی انسان کو ناقص العقل اور تہذیب و تمدن سے نابلد قرار دے رہا ہے جس کے ہاتھوں سے بنے ہوئے فنونِ لطیفہ کے ان عدیم المثال نمونوں کو دیکھنے کے لئے آج وہ اتنی دور سے چل کر آیا ہے۔ عجائب گھر کے سارے نوادرات کو ہم مختلف حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جن کا تفصیلی ذکر ذیل میں مختلف عناوین کے تحت کیا جاتا ہے۔

پتھروں اور پتھروں پر ابھرے ہوئے نقوش (STONE, STUCCO & TERRACOTTA SCULPTURES & RELIEFS)

مختلف شہروں، ٹیلوں اور خانقاہوں سے پتھر پر ابھرے ہوئے نقوش کی صورت میں جو تصاویر یا بت برآمد ہوئے ہیں۔ انہیں ان کی برآمد ہونے والی جگہوں کے لحاظ سے مختلف الماریوں میں رکھا گیا ہے ان میں سے اکثر و بیشتر گوتم بدھ کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ بعض جگہوں پر بدھ کی زندگی سے متعلق مختلف مناظر کو پتھر پر کھود کر پیش کیا گیا ہے —— واضح رہے کہ سارے بت پتھر سے تیار شدہ نہیں ہیں بلکہ بعض پختہ مٹی سے اور کچھ چونا سے بھی بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح کچھ مجسمے مکمل اور کچھ ٹوٹے پھوٹے ہیں یہاں ہم ان میں سے زیادہ دلچسپ اور جاذب توجہ مجسموں کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

ایک مجسمہ میں گوتم بدھ کے بدکردار ابنِ عم دیوادتّا[1] (DEVADATTA) کی گوتم بدھ پر ایک بھاری پتھر گرا کر قتل کرنے کی تین سازشوں میں سے ایک کی منظر کشی کی گئی ہے۔ بدھ ایک طرف کھڑے ہیں اوپر سے ایک پتھر گرتا دکھایا گیا ہے لیکن ان کے مجسموں میں سے ایک اس پتھر کو اپنے زورِ بازو سے بدھ پر گرنے سے روک رہا ہے۔

---

[1] دیوادتا SUPRABUDDHA کا بیٹا تھا۔ پہلے بدھ کا پیروکار تھا لیکن بعد میں دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے اور وہ بدھ کو قتل کرنے کے عزائم باندھنے لگا۔ اس کی تفصیلات کے لئے دیکھئے "BUDDHISM" BY BHIKKHU ANANDA (BUDDHIST WORLD PUBLICATIONS) صفحہ ۸۹ زیرِ عنوان "DEVADATTA — THE BUDDHA'S RIVAL"

ایک جگہ گوتم بدھ کو بودھی درخت (BODHI - TREE)[1] کے نیچے بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے یا کہ درخت کی تصویر ہے جس کے نیچے کہا جاتا ہے بدھ نے اپنی ریاضت کے کئی سال گزارے تھے
ایک ابھرے ہوئے نقش میں بدھ کے دائیں جانب جین تیسوی (TIRTHANKAR)[2] کو بالکل ننگے ہونے کی حالت میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک پتھر پر بدھ کے ساتھ دائیں ہاتھ ایک برہمن درویش کی تصویر بنی ہوئی ہے۔
یہ سب مجسمے دھرمارا جیکا سٹوپا سے برآمد شدہ ہیں۔
ایک جگہ گوتم بدھ اندرت لا غار کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح بدھ کو کنول کے پھول کے اوپر بیٹھا ہوا بھی دکھایا گیا ہے — بدھ کا ایک چھوٹا سا اور مجسمہ جس پر سونے کا پانی پھرے ہونے کے کچھ کچھ آثار ابھی تک باقی ہیں میوزیم کے اہم ترین نوادرات میں سے ہے۔ یہ مجسمے جولیاں سے دستیاب ہوئے ہیں ——— تین چار مجسمے بدھ کو بحالت مراقبہ یا پھر لوگوں کے سامنے اپنی تعلیمات پیش کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ بدھ کے ساتھ بودھی ستوا (BODHISATTVAS)[3] اور دیوا (DEVAS)[4] بھی نظر آتے ہیں یہ مجسمے چونے سے تیار شدہ ہیں موٹر لہراد

---

[1] حق و صداقت کی تلاش میں گوتم بدھ نے بہت سے ممتاز سادھوؤں کی صحبت اختیار کی۔ جن میں سے ALARA KALAMA اور UDDAKA RAMAPUTTA کے نام سرفہرست ہیں تاہم اطمینان قلب حاصل نہ ہوا کہا جاتا انہیں ایک جگہ ٹک کر نہ بیٹھنے دیتی تھی یہاں تک وہ گیا (GAYA) پہنچ گئے اور

"FINDING THE PLACE BEAUTIFUL & SERENE HE SAT DOWN UNDER A BO-TREE NEAR THE VILLAGE OF URUVELA, RESOLVING NOT TO MOVE UNTIL DELIVERANCE WAS FOUND "LET MY SKIN, SINEWS AND BONES BE LEFT MAY MY BLOOD AND FLESH DRY UP AND WITHER AWAY, YET NEVER FROM THIS SEAT WILL I STIR UNTIL I HAVE ATTAINED FULL ENLIGHTENMENT ,

(ENLIGHTENMENT) زیر عنوان ۱۹ ص BHIKKHUANANDA از "BUDDHISM")

[2] جین مت کا راہنما

[3] اسی کتاب کے حوالہ سے جس کا ذکر پہلے حاشیہ میں ہو چکا ہے۔

THE TERM BODHISATTVA REFERS TO BUDDHA ASPIRANT

اس لحاظ سے ہم بودھی ستوا اس شخص کو کہہ سکتے ہیں جس کے متعلق امید کی جا سکے کہ وہ آئندہ زمانہ میں بدھ بنے گا یعنی گوتم بدھ سے ایک آدھ درجہ کم بدھ کو بودھی ستوا کہا جا سکتا ہے۔

[4] DEVAS سے مراد دیوتا۔

کے سب سے بڑے ستوپا کی جنوبی جانب سے ملے ہیں اور چوتھی اور پانچویں صدی مسیحی کے دوران کسی وقت بنائے گئے۔ انہی کی طرح کا ایک اور مجسمہ بھی موجود ہے جو اسی زمانہ کا ہے اور اسی منظر کو لئے ہوئے ہے۔ اس کا ماخذ موہڑا مرادو کی ایک خانقاہ ہے۔ یہ مجسمے خاصے بڑے ہیں۔ پتھر کی ایک مورت میں بدھ کو عبادت میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ چونے سے تیار شدہ ایک تختی پر بدھ کی وفات کا منظر (MAHA PARINIRVANA) دکھایا گیا ہے۔ اس کا ماخذ بھامالا ہے تقریباً تیسری سے چوتھی صدی عیسوی کے دوران کسی وقت یہ تختی وجود میں لائی گئی۔ ایک مجسمہ میں بدھ کو اپنا پہلا دینی لیکچر[1] دیتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ ایک جگہ گوتم سوچ بچار میں مصروف ہیں اور گرد آپ کے پیروکار اور بعض ناظرین کھڑے ہیں ——— اس کا ماخذ جولیاں ہے اور غالباً چوتھی سے پانچویں صدی عیسوی کے دوران کسی وقت بنا۔ اسی طرح کے ایک اور مجسمہ میں بدھ بحالت مراقبہ نظر آتے ہیں۔ یہ مجسمہ چونے سے تیار شدہ ہے جبکہ اول الذکر پتھر کا بنا ہوا ہے۔ ایک مجسمہ میں گوتم بدھ پوری طرح کھڑے ہیں ——— یہ دھرماراجیکا ستوپا سے دستیاب ہوا ہے اور پاؤں کے قریب سے ٹوٹا ہوا ہے۔ دھرماراجیکا ستوپا سے حاصل ہونے والے دیگر مجسموں میں سے قابل ذکر یہ ہیں:

گوتم بدھ کا جی دنیا میں نہ لگتا دیکھ کر ان کے باپ نے انہیں ہر طرح سے دنیا کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی اور چاہا کہ کسی طرح ان کا بیٹا دنیاوی امور میں دلچسپی لینے لگے چنانچہ ہر طرح کے حیلے بہانے انہوں نے کئے۔ ناچ رانگ کے ذریعہ ان کی اداسی اور بے چینی دور کرنے کی سعی ناکام بھی کی۔ "گوتم بدھ کے تارک الدنیا ہونے سے قبل محل میں سوئی ہوئی مغنیہ کا منظر" غالباً اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ایک اور جگہ کنتھکا (KANTHAKA) نامی گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے محل سے فرار ہونے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ ایک مجسمہ میں لوگ بدھ کی پرستش کر رہے ہیں۔ ایک جگہ ایک بندر بدھ کی خدمت میں شہد کا تحفہ پیش کر رہا ہے ایک شکستہ مجسمہ کے موجودہ باقی ماندہ حصہ میں نندا[2] کی تبدیلی مذہب کا نامکمل منظر نظر آ رہا ہے ——— بودھی ستوا

---

[1] بدھ کا FIRST SERMON کیا تھا تفصیل کے لئے دیکھئے (BUDDHISM BY EDWARD J. THOMAS, PAGE 29 to 33

[2] غالباً یہ وہی نندا ہے جو گوتم بدھ کی دوسری والدہ MAHA RAJPATI کا بیٹا تھا۔ (از BUDDHISM BHIKKHU ANANDA صفحہ ۷) نندا کی تبدیلی مذہب کے واقعہ کی تفصیلات کے لئے دیکھئے - یہی کتاب صفحہ ۴۸ تا ۴۶ ، زیر عنوان "ORDINATION OF PRINCE NANDA")

کے دو مجسمے، جن میں سے ایک موہڑا مرادو سے ملا ہے۔ بھی میوزیم میں ہیں۔

ایک جگہ SINHAVALINI کو شیر کی شکل پر بیٹھے ہوئے تخت پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے سنگتراشی کا یہ نمونہ چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی سے متعلق ہے۔

ایک بڑے مجسمے میں جو پکی ہوئی مٹی سے چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی کے قریب بنایا گیا اور اب جولیاں کی ایک خانقاہ سے برآمد ہوا ہے بدھ کو بودھی ستوا اور دیوتاؤں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

ان کے علاوہ میوزیم میں گوتم بدھ کے سر کے بہت سے مجسمے بھی موجود ہیں جو عام انسانی سر سے تقریباً آٹھ دس گنا بڑے ہیں اور دھرما راجیکا سٹوپا اور جولیاں سے ملے ہیں۔

گوتم بدھ کے ان مجسموں کے علاوہ عجائب گھر کی بہت سی الماریاں موہڑا مرادو، جولیاں، سرکپ، گری، بھالا اور دھرماراجیکا سٹوپا وغیرہ سے حاصل ہونے والے پختہ مٹی اور چونے سے تیار شدہ فنون لطیفہ کے نمونوں سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں سے اکثر صرف سروں کی شکلیں ہیں جن میں عورتیں، مرد، بچے بوڑھے بھی شامل ہیں بعض نامکمل مجسمے بھی ہیں۔ کچھ جانوروں مثلاً بیل، شیر وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے بت بھی موجود ہیں۔ جو زیادہ تر دوسری سے پانچویں صدی مسیحی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پتھر کے بعض ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے اس زمانہ کے فن تعمیر پر بھی روشنی ڈال رہے ہیں۔ ایک جگہ ایک نوجوان پھولوں اور پھلوں سے بھری ہوئی ٹوکری لئے کھڑا ہے۔ یہ مجسمہ پکائی ہوئی مٹی کا ہے تقریباً چوتھی یا پانچویں عیسوی میں بنایا گیا۔ اور اب جولیاں کے ایک مندر سے برآمد ہوا ہے

کندہ تحریریں

ٹیکسلا عجائب گھر میں تحریریں جو پتھر یا دھاتی تختیوں پر کتبوں کی صورت میں یا ویسے کندہ ہیں بہت کم ہیں تاہم جو ہیں وہ خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ چنانچہ بڑے ہال کی مغربی دیوار کے ساتھ ایک شوکیس میں ہمیں ایک پتھر پر آرامی تحریر کا نمونہ نظر آ رہا ہے۔ اس کے نیچے تعارفی تختی پر تحریر ہے "کندہ شدہ آرامی تحریر (ARAMIC INSCRIPTION)

"یہ کندہ کی ہوئی تحریر جو سرکپ (ٹیکسلا) میں ایک دیوار سے حاصل ہوئی ہے پاکستان کے شمال مغربی علاقہ میں آرامی زبان (جس سے خروشتی KHAROSHTHI زبان بنی) کے استعمال کی واحد مثال ہے اس میں (اس علاقہ کے نائب) حکمران PRIYADARSI اس کی ملکہ اور بیٹوں کا بھی ذکر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ احکامات تیسری صدی قبل مسیح کے پہلے نصف میں موریہ خاندان کے حکمران اشوک نے جاری کیے جو اُن دنوں ٹیکسلا کا حکمران تھا۔"

مزید برآں بعض منقش تختیاں اور جزوی تحریریں (VOTIVE TABLETS AND FRAGMENTARY MANUSCRIPT) بھی موجود ہیں ان میں سے کچھ تو گندھارا تہذیب سے متعلق ہیں جو پتھر کی ہیں اور ان پر خروشتی زبان تحریر ہے ملا

کے ساتھ انگریزی زبان میں ان کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ کچھ تحریرات صنوبر کی چھال پر کھدی ہوئی ہیں اور گپتا دور کے آخری زمانہ سے متعلق تھیں۔ BRAHMI طرز تحریر پر یہ تختیاں کندہ ہیں اور ان کا زمانہ تیسری سے پانچویں صدی عیسوی کے درمیان ہے ۔۔ یہ تحریریں دھرمارا جیکا سٹوپا سے ملی ہیں۔

علاوہ ازیں جولیاں سے بھی کچھ تحریریں ملی ہیں جو چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی سے متعلق ہیں۔ مٹی کی چند مہریں بھی حاصل ہوئی ہیں جن پر بدھ اعتقاد "YE DHARMA HETU PRABHA" کے الفاظ درج ہیں۔ یہ مہریں جو عموماً سٹوپوں اور بتوں کے اندر گڑی ہوتی تھیں، گپت دور سے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔

سکے

نوادرات کے اس بڑے ہال نمبر میں ایک شوکیس سکوں کے لئے مخصوص ہے۔ ان میں سے KUSHAN اور SCYTHO PARTHIAN دور کے سکے خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے یہ سکے ۱۱ ق م سے ۲۲۶ سنہ عیسوی کے درمیان اس علاقہ پر حکومت کرنے والے مختلف بادشاہوں کے عہد سے متعلق ہیں۔ ان میں سے بعض سکے سونے کے اور باقی چاندی، کانسی کچھ دیگر دھاتوں کے بنے ہوئے ہیں۔ اکثر سکے گول ہیں کچھ چوکور بھی ہیں۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے ان میں سے سب سے چھوٹا سکہ ہمارے نئے پیسے کے برابر بلکہ اس سے بھی ذرا چھوٹا ہی ہے۔

مزید برآں باختری اور ہندی یونانی ضربات کے نمونے بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ سکے باختر اور شمال مغربی ہندوستان کے یونانی بادشاہوں کی یادگار ہیں۔ اوّل الذکر سکے ۲۵۵ سے ۱۸۰ ق م کے زمانہ کے ہیں، جب کہ مؤخر الذکر ۱۹۰ سے ۱۸۰ ق م اور ۱۲۶ ق م سے ۵۰ عیسوی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یاد رہے یہ سکے بھی مختلف سائز اور مختلف دھاتوں کے ہیں۔

تبرکاتی ڈبیاں

بدھوں کا طریق تھا کہ وہ گوتم بدھ یا کسی اور ممتاز بدھ مذہبی راہنما کی کوئی ہڈی یا ان کے جسم کے کسی اور حصہ کو جسے وہ 'DHATU'[1] کا نام دیتے بطور تبرک سونے یا چاندی کے کسی برتن میں ڈال دیتے

---

[1] "BUDDHIST DICTIONARY" از NYANATILOKA میں اس کے معنی لکھے ہیں:۔
'ELEMENTS' ARE CALLED ULTIMATE CONTITUENTS OF A WHOLE
مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ [illegible]

اندر پھر بہت سے ہیرے جواہرات اور موتیوں کے ساتھ سونے چاندی کا وہ برتن پتھر یا ہاتھی دانت کے کسی بڑے برتن میں رکھ دیا جاتا ۔ بعد ازاں ایک سٹوپے میں جو خاص اس تبرک کو رکھے جانے کے لئے بنایا جاتا تھا ۔ اس ڈبے کو محفوظ کر لیا جاتا ۔

اس طریق پر محفوظ شدہ آج بھی بہت سی تبرکاتی ڈبیاں موجود ہیں جو مختلف ڈیزائنوں کی ہیں اور سونے چاندی اور ہاتھی دانت وغیرہ سے بنی ہوئی ہیں ۔ موتیوں کی کچھ لڑیاں اور کھلے ننھے ننھے چمکدار موتی بھی ان کے ساتھ پڑے ہوئے ہیں ۔

یہ ڈبیاں سرکپ ، دھرمراجیکا سٹوپا ، کلاوان اور جولیاں سے ملی ہیں اور ۱۰۰ ق م سے ۵۰۰ عیسوی کے زمانے سے متعلق ہیں ۔ نیز جولیاں کے مندر نمبر ۱۱ سے کی گئی چونے سے تیار شدہ ایک سٹوپ نما یادگار (RELIC CASKET) بھی یہاں ہے

زیورات اور سنار کے اوزار

بڑے ہال کا ایک ذیلی کمرہ زیورات کے مخصوص ہے جس میں سونے چاندی کے مختلف جگہوں سے دستیاب ہونے والے اور مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والے ہر قسم کے زیورات رکھے گئے ہیں یہاں قیمتی دھاتوں سے بنی ہوئی بعد نمونہ نما مہریں اور ہیرے وغیرہ بھی ہیں ؎ ۔ نیز ہاتھ سے بنی ہوئی ایک تصویر بھی موجود ہے جو ٹیکسلا عجائب گھر کے پہلے نگران ایم این گپتا کے فن کا نمونہ ہے ۔ تصویر کے نیچے لکھا ہے ۔

PAINTING SHOWING THE VARIOUS ORNAMENTS AS WORN IN ANCIENT DAYS DRAWN BY LATE MR M.N. GUPTA CURATOR 1928-45

یہ تصویر دو عورتوں کی ہے ـــــ اس کے علاوہ میوزیم میں مختلف مقامات سے دستیاب ہونے والے موتی بھی ہیں ۔ تمام موتیوں کی اقسام اور جہاں سے ملے ہیں ہر بات تفصیلاً ساتھ ہی درج ہے ۔

سرکپ شہر سے ایک سنار کی دکان سے ذیل کی چیزیں برآمد ہوئی ہیں :-

پتھر کے اوزار ـ یہ مختلف قسموں کے گنید نما ٹکڑے ہیں جو بڑی صفائی سے تراشے گئے ہیں ، کٹھالیاں ، کسوٹی بہت سی قسموں کے قیمتی پتھر ، چاندی کی دو کٹھالیاں ـــ مرصع کاری کے لئے اور اسی مقصد کے لئے تانبے اور کانسی کی سجاوٹی اشیا ۔

علاوہ ازیں یہ آلات مختلف جگہوں سے حاصل ہوئے ہیں :- سناروں کی ہتھوڑیاں ۔ چمٹے ۔ اہرنیں (ANVILS)

؎ اس کمرہ کے زیورات میں کانوں کے جھمکے ، نیکلس ، انگوٹھیاں اور کڑے وغیرہ شامل ہیں جو عیسوی صدی قبل مسیح سے پہلی صدی عیسوی کے زمانے کے ہیں ۔

AZES کے سکوں کے سانچے، کٹھالیاں، کانسی کی دھونکنیاں، انگوٹھیاں اور بالیاں بنانے کے لئے پتھر کے سانچے۔ یہ اشیاء ۵۰۰ ق م سے ۳۰۰ ق م کے دوران بنائی گئیں۔

یہ ذیورات بھی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں:۔ کانسی کی چوڑیاں اور کڑے ۳۰۰ ق م تا چوتھی صدی عیسوی۔ سیسہ کی انگوٹھیاں، بھیڑ ماؤنڈ سے ۳۰۰ ق م ۔ کانسی کے بکسوے۔ سرکپ سے، پہلی صدی عیسوی ۔ اور چاندی، تانبے اور کانسی کی انگوٹھیاں۔ تانبے اور کانسی کے لاکٹس ۔ مختلف جگہوں سے، ۳۰۰ ق م تا تیسری صدی عیسوی۔ دھرماراجیکا سٹوپا اور جولیاں سے ملنے والی انگوٹھیاں بھی عجائب گھر کی زینت بنا ہوئی ہیں۔

دھاتی اشیا

دھاتی برتن:۔ اس زمانہ کے بنے ہوئے دھات کے بہت سے برتن عجائب خانہ کی زینت و دلچسپی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہاں ان برتنوں کے صرف نام گنا دیئے جاتے ہیں۔

لیجئے یہ ایک کانسی کا بڑا پیالہ ہے تجزیہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس میں مختلف دھاتوں کی آمیزش کی نسبت یہ ہے:۔

تانبا: ۷۶٫۷۶، ٹین ۲۱٫۵۵، لوہا ۹۵، سنکھیا ۷۶، نکل ۲۴۸ یہ برتن بھیڑ ماؤنڈ سے ملا ہے اور ۳۰۰ ق م کا بنا ہوا ہے۔ کانسی کے اسی قسم کے بعض اور برتن بھی اس کے ساتھ ہیں۔ سرکپ کی کھدائی کے نتیجہ میں جو برتن دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے ایک گھڑا اور مختلف سائز کے چمچے خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ لوہے کی کڑاہیاں۔ پیالے طشت، لوہے کی صراحیاں، جام، جگ اور فرائی پان وغیرہ بھی اسی جگہ سے برآمد ہوئے ہیں

دھرماجیکا سٹوپا اور جولیاں سے حاصل ہونے والے برتنوں میں کانسی کے پیالے قابل ذکر ہیں

ہتھیار: دادی ٹیکسلا کی کھدائی کے دوران مختلف قسم کے جو ہتھیار برآمد ہوئے ہیں، یہ ہیں لوہے کی کلہاڑیاں خود، آری، چاقو، گنڈاسے، تیر کی نوکیں (ARROW HEADS) نیزے اور تلواریں ۔ یہ سب چیزیں لوہے سے بنی ہوئی ہیں اور سرکپ ان کا ماخذ ہے۔

دیگر دھاتی اشیاء:۔ دھات کے برتنوں اور ہتھیاروں کے علاوہ روزمرہ کی زندگی میں اور بہت سی کام آنے والی اشیاء (جو لوہے یا دیگر دھاتوں کی بنی ہوئی ہیں) بھی ملی ہیں۔

بھیڑ ماؤنڈ سے رنبے، کدال، مختلف سائز کے ہتھوڑے اور مختلف قد و قامت کی میخیں حاصل ہوئی ہیں۔

سرکپ سے گھڑا، چابیاں، گھوڑے کی لگام، سلاخیں، بیلچے، مہریں، تپائی اور کنڈے وغیرہ ملے ہیں۔ یہ بھی چیزیں لوہے سے تیار کردہ ہیں نیز دھاتی لیمپ سٹینڈ، عطردان، دواتیں، چار پہیوں والی گاڑی، اہرن وغیرہ اشیاء بھی ملی ہیں

دھرماجیکا سٹوپا سے لوہے کی گھنٹیاں اور تانبے کی چھریاں حاصل ہیں

سرکپ سے تانبے اور کانسی کی دواتیں برآمد ہوئی ہیں جو اپنی وضع میں انوکھی ہیں ان کا زمانہ ۱۰۰ ق م سے دوسری

صدی عیسوی تک ہے

مختلف جگہوں سے تانبے اور لوہے کی گھنٹیاں بھی ملی ہیں جو ۳۰۰ ق م سے چوتھی صدی عیسوی تک کے دور سے تعلق رکھتی ہیں اسیطرح تانبے کا ایک لخلخہ (INCENCE BURNER) بھی وہاں موجود ہے۔ کانسی اور لوہے کے لخلخے بھی ہیں جو پہلی سے تیسری صدی عیسوی سے متعلق ہیں۔

مزید براں وسطی ایشیا میں ان دنوں گھوڑے کی جس قسم کی لگام کا رواج تھا اس کا نمونہ بھی میوزیم میں موجود ہے۔

مٹی کی اشیاء

ٹیکسلا عجائب گھر میں بہت سی الماریاں اس علاقہ کی کھدائی کے دوران ملنے والے مٹی کے برتنوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ برتن زیادہ تر سرکپ، دھرمار اجیکا سٹوپا، اور بھیڑ ماؤنڈ سے ملے ہیں۔ ان برتنوں میں سے مختلف سائز اور شکلوں کے مٹکے، گھڑے، صراحیاں، ڈھکنے دار کونڈیاں، اس زمانے میں روزمرہ میں استعمال ہونے والے ٹبوں کے مشابہ ٹبلے، جگ، ڈشیں، فرانسیسی بینیر کی طرز کے برتن، آبخورے، ہنڈیاں، اور پکانے کے دوسرے برتن، بڑے بڑے ڈش نما گول پیالے، منقش برتن، پیچیں، آدمیوں، جانوروں اور مختلف قسم کی گھنٹیوں کی شکل کے برتن، مرتبان اور پیالے خصوصاً دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ ان میں سے اکثر کی بناوٹ بالکل آج کل کے برتنوں کی سی ہے اور مضبوطی واقعی ظاہر ہے۔ کچھ برتن ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں خصوصاً مٹکے، اور بعض کے کچھ حصے غائب ہیں۔

مٹی کے برتنوں کے علاوہ مٹی سے تیار شدہ اور بھی بہت سی چیزیں میوزیم میں موجود ہیں۔ جن میں سے مردوں، عورتوں اور جانوروں کے دھڑوں کے مجسمے، دواتیں، کھلونے، دیئے، مالائیں، نکاسی نالیاں، پتلے اور لخلخے وغیرہ قابل دید ہیں۔

شیشے کی اشیاء

میوزیم میں شیشے کی اشیاء کم ہیں البتہ جتنی ہیں جاذب نظر ہیں اور اس زمانہ کی تہذیب کی نشاندہی کرتی ہیں۔ چنانچہ دھرمار اجیکا سٹوپا سے شیشے کی فرشی اینٹیں ملی ہیں۔ اگر سرسری طور پر دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے اینٹیں پتھر سے تراشی گئی ہوں۔ مگر غور سے دیکھنے پر حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ موجودہ صورت میں یہ اینٹیں ٹوٹی ہوئی ہیں اور ان کے ٹکڑوں کو فریموں (FRAMES) میں منضبط کیا گیا ہے۔ ان اینٹوں کے علاوہ مختلف جگہوں سے حاصل ہونے والی شیشے سے تیار شدہ اشیاء میں سے ذیل کی چیزیں خصوصی توجہ کی مستحق ہیں

صراحیاں (FLASKS) — ان کا ماخذ سرکپ ہے اور پہلی صدی عیسوی سے متعلق ہیں۔ — مختلف رنگوں کے کڑوں اور چوڑیوں کے ٹکڑے جو تمام وادی ٹیکسلا سے حاصل ہوئے ہیں — ان کی تاریخ ۶۰۰ ق م سے پانچویں صدی عیسوی

کے بھی ہوا ہے ۔
سٹوپے اسٹوپوں کے نمونے یا ان کے کچھ حصے۔ جونہی ہم عجائب گھر کے شاندار ہال کے اندر داخل ہوتے ہیں ہمیں اپنے سامنے سفید رنگ کی ایک بلند سی چیز نظر آتی ہے ۔ یہ موہڑا مرادو کی خانقاہ سے دستیاب شدہ سٹوپا کی نقل ہے جولیاں سے سٹوپا نمبر ۱ جس کی بنیاد مربع شکل کی ہے اٹھا کر میوزیم میں رکھ دیا گیا ہے اس کے گرد خاصے خوبصورت نقش و نگار کے علاوہ گوتم بدھ کی جانوروں مثلاً شیر، گھوڑے، ہاتھی وغیرہ کی، اور عام انسانی شکلیں بنی ہوئی ہیں ۔
دھرماراجیکا کے منتی سٹوپا (VOTIVE STUPA) کے بعض ٹکڑے بھی یہاں ہیں ۔ اسیطرح سرکپ کے مندر نمبر ۱ سے چھتریاں اور جنگلے، عجائب گھر میں منتقل کر کے مزید دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا گیا ہے ۔

متفرقات

پتھر کی اشیاء۔ علاوہ ان بتوں کے جن میں سے زیادہ اہم کا ذکر اوپر زیر عنوان "بت اور پتھروں پر ابھرے ہوئے نقوش" کیا جا چکا ہے پتھر کی اور بھی بہت سی اشیاء عجائب خانہ میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔ ڈھکنے، قیمتی اشیا مثلاً ہیرے جواہرات وغیرہ محفوظ رکھنے کے لئے ڈبے، لیمپ اور سل بٹہ ۔۔ یہ اشیاء دوسری صدی عیسوی سے متعلق ہیں۔ اور سرکپ سے ملی ہیں۔ نیز گندھارا تہذیب کے ابتدائی دور کی یادگار پتھر کے کچھ چھوٹے چھوٹے بت بھی یہاں موجود ہیں ان کا زمانہ پہلی صدی قبل مسیح کا ہے ۔
سامان آرائش ۔ مختلف جگہوں سے دستیاب ہونے والے سامان آرائش کی تفصیل یہ ہے۔
تانبے کے شیشے (COPPER MIRRORS) ہاتھی دانت کے دستوں کے ساتھ (۱۰۰ ق م تا تیسری صدی عیسوی) سرکپ سے ہاتھی دانت کی کنگھیاں (۲۰۰ ق م تا پہلی صدی عیسوی) ۔ سرکپ سے ، کانسی کی ڈبیاں ۔ سنگھار کا سامان رکھنے کے لیے (۱۰۰ ق م تا دوسری صدی عیسوی) سرکپ سے ۔ ہاتھی دانت اور کانسی کے خلال اور کان کریدنیاں (۳۰۰ ق م تا چوتھی صدی عیسوی) سرکپ سے ۔ سرمہ دانیاں اور سلائیاں نیز کانسی اور ہاتھی دانت کی سوئیاں ۔ (۳۰۰ ق م تا چوتھی صدی عیسوی) ۔ مختلف جگہوں سے ۔
دیگر شیشے کی اشیاء۔ یہیں دھرماراجیکا سٹوپا سے ملنے والی شیشے کی اینٹوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جولیاں سے بھی اسی قسم کی اینٹیں ملی ہیں ۔ ان کی تعداد ۴۳ ہے۔ سوائے ایک کے سبھی کا سائز تقریباً ایک سا ہے اور منقش ہیں۔ لیکن بات قابل غور ہے کہ ساری اینٹوں کے نقش و نگار میں تنوع پایا جا رہا ہے ۔۔۔ یہ اینٹیں پختہ مٹی سے بنی ہوئی ہیں ۔ میوزیم میں ایک چارپائی کے پائے بھی موجود ہیں جن کا خول تانبے کا ہے اور اندرونی حصہ لکڑی کا ہے ۔
لیجئے! دن کا تھکا ہارا مسافر ہماری دنیا سے نہایت دور جا رہا ہے ۔ عجائب خانہ کے دروازے کل دوبارہ اپنے تماشائیوں کے لئے کھلنے کو بند ہوا چاہتے ہیں اس لئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اس مضمون کا اختتام کیا جاتا ہے تاہم جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ صدیوں پہلے کا "غیر متمدن" انسان بھی کس قدر متمدن تھا ۔

لطیف گجراتی
بی ایس سی سال دوم

ارضی سیارے!

نظامِ شمسی سورج، ستاروں، طفیلی یا تابع سیاروں، سیارچوں، دمدار ستاروں اور شوٹنگ سٹارز (شہاب ثاقب) پر مشتمل ہے۔ یہ سب کے سب اجسام سورج کی کشش کے زیرِ اثر سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں۔

ستیارہ اُن نو (۹) بڑے بڑے اجسام میں سے کسی ایک کو کہتے ہیں جو کہ زمین کی طرح براہِ راست سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ ان کے نام سورج سے ہر ایک فاصلے کے لحاظ سے یہ ہیں۔ مشتری یا عطارد، زہرہ، زمین۔ مریخ۔ جیوپیٹر، زحل، یورینس، نیپچون، اور پلوٹو! حجم کے لحاظ سے ان سیاروں کے دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک وہ جو قریباً قریباً زمین کے برابر حجم کے ہیں انہیں عام اصطلاح میں ارضی سیارے کہتے ہیں۔ زمین سمیت ان کی تعداد چار ہے یعنی عطارد، زہرہ، زمین، اور مریخ۔ دوسرے چار یعنی جوپیٹر، زحل، یورینس اور نیپچون جو پہلے چاروں کی نسبت بہت بڑے ہیں۔ MAJOR PLANETS کہ یا بڑے سیارے کہلاتے ہیں۔ نواں سیارہ یعنی پلوٹو فی الحال ان دونوں میں سے کسی تقسیم میں نہیں آتا کیونکہ اس کے متعلق آج تک جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ باقی سیاروں کی نسبت حجم میں بہت ہی چھوٹا ہے۔

ان دریافت شدہ نو سیاروں کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے اجسام موجود ہیں جو سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں ان کو MINOR PLANETS یا چھوٹے سیارے کہتے ہیں۔ انہیں ASTEROIDS یا سیارچے بھی کہتے ہیں۔ پچھلے قریباً ایک سو چالیس سالوں میں اس قسم کے

قریباً تین ہزار ایسے جن میں سے ہر ایک کا قطر کم و بیش پانچ سو میل ہے دریافت کئے جا چکے ہیں۔ یہ سیارچے کئی لحاظ سے دوسرے بڑے سیاروں سے ملتے جلتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان میں اور ان میں بڑے واضح فرق موجود ہیں۔ ان سیارچوں میں سے زیادہ کے مدار مریخ اور جیوپیٹر کے درمیان واقع ہیں اگر زمین کے شمالی قطب پر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سیاروں اور سیارچوں کی گردش

کی سمت گھڑی کی سوئیوں سے مخالف ہے۔ اس قسم کی گردش کو DIRECT MOTION یا گردش راست کہتے ہیں۔ زمین کے لحاظ سے گردش راست مغرب سے مشرق کی سمت کو ہے۔

اندرونی اور بیرونی ستیارے ــــــ سیاروں کی گروہ بندی کا ایک دوسرا طریق یہ ہے کہ جن سیاروں یا سیارچوں کے مدار زمین کے مدار سے اندر کی طرف واقع ہیں۔ انہیں اندرونی ستیارے یا سیارچے کہا جائے اور جن کے مدار زمین کے مدار سے باہر واقع ہیں۔ انہیں بیرونی! اس لحاظ سے پہلی قسم میں صرف عطارد اور زہرہ اور ان دو کے علاوہ تین چھوٹے ستیارے یعنی سیارچے آتے ہیں اور دوسری قسم میں مریخ، جیوپیٹر، زحل، یورینس، نیپچون اور پلوٹو سیاروں کے علاوہ قریباً تین ہزار سیارچے بھی آتے ہیں ــــــ تمام سیارے اور سیارچے سورج کے گرد ایک ہی سمت میں یعنی مغرب سے مشرق کو گردش کرتے ہیں۔ ان سب کی رفتاریں سورج سے فاصلہ زیادہ ہونے کے ساتھ گھٹتی اور کم ہونے کے ساتھ بڑھتی ہیں۔

سورج اور زمین کے لحاظ سے باقی سیاروں کے محلِ وقوع

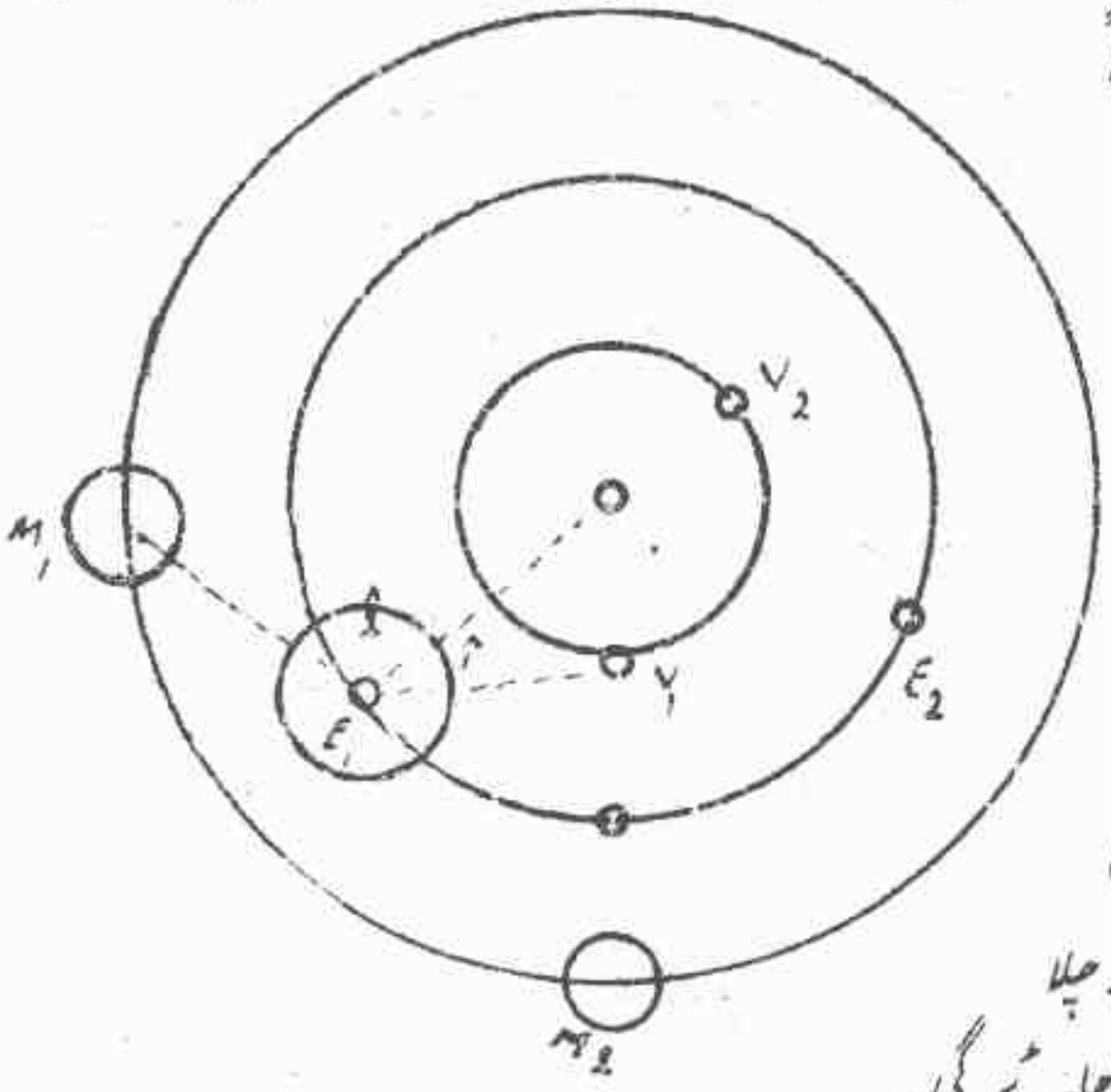

کسی ستیارے کی ELONGATION یا کھنچاؤ زمین سے اس ستیارے اور سورج تک خطوط کھینچنے سے بننے والے زاویہ کو کہتے ہیں۔ مثلاً سامنے دی ہوئی شکل میں زاویہ نمبر ۱ زہرا کے کھنچاؤ یا ELONGATION کو ظاہر کرتا ہے اور زاویہ نمبر ۲ مریخ کے کھنچاؤ یا ELONGATION کو ا ـــ

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر ستیارے کی حرکت کے ساتھ اس کی ELONGATION یا کھنچاؤ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً اس شکل میں اگر زہرہ اپنے مدار پر V سے V_2 پر چلا جائے تو اس کی ELONGATION میں تبدیلی آجائے گی۔ اسی طرح مریخ اگر M سے M_2 پر چلا جائے تو اس کی ELONGTION بھی تبدیل ہو جائے گی۔ اور زمین کی حرکت کی وجہ سے دونوں کے کھنچاؤ میں ایک وقت مختلف تبدیلی واقع ہوگی۔

فلکیاتی اکائی (THE ASTRONOMICAL UNITS)

بین السیاروی فاصلوں کو ماپنے کے لئے میل کی اکائی بہت چھوٹی ہے اس لئے زمین اور سورج کا اوسط درمیانی فاصلہ اکائی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جو نو کروڑ تیس لاکھ تیس ہزار میل ہے۔ اسے فلکیاتی اکائی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اکائی نوری سال LIGHT YEAR بھی ہوتی ہے۔ یہ وہ فاصلہ ہے جو روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ایک سال میں طے کرتی ہے۔ لیکن یہ اکائی بہت ہی لمبے فاصلے ماپنے کے کام آتی ہے نظام شمسی کے سیاروں کے سورج سے اوسط فاصلے 0.387 فلکیاتی اکائیوں (عطارد کا سورج سے فاصلہ) سے لے کر 39.5 فلکیاتی اکائیوں (پلوٹو کا فاصلہ) کے درمیان ہیں۔

بوڈ کا قانون (BODE'S LAW) ۱۷۷۲ء میں ایک ماہر فلکیات "بوڈ" نے دنیا کے ہیئت دانوں کی توجہ ہندسوں کے ایک خاص سلسلے کی طرف مبذول کرائی جو اس سے چھ سال پہلے TITUS نے دریافت کیا تھا۔ اس سلسلے کو عموماً بوڈ کا قانون کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم ۹ بار پہلو بہ پہلو چار کا ہندسہ لکھ لیں اور پہلے چار میں صفر دوسرے میں تین تیسرے میں چھ چوتھے میں بارہ اور اسی طرح پانچویں میں چوبیس اور چھٹے میں اڑتالیس وغیرہ جمع کرتے چلے جائیں۔ تو جو کچھ حاصل ہوگا وہ نو سیاروں کی سورج سے فاصلوں میں نسبت ہوگی۔ یعنی

۴ + ۰	۴ + ۳	۴ + ۶	۴ + ۱۲	۴ + ۲۴	۴ + ۴۸	۴ + ۹۶	۴ + ۱۹۲	۴ + ۳۸۴
۴	۷	۱۰	۱۶	۲۸	۵۲	۱۰۰	۱۹۶	۳۸۸
عطارد	زہرہ	زمین	مریخ	جوپیٹر	زحل	یورینس	نیپچون	پلوٹو

لیکن مسلسل یہ قانون صرف یورینس تک ٹھیک رہتا ہے اور آخری دو سیاروں نیپچون اور پلوٹو پر جا کر ناکام ہو جاتا ہے ہیئت دان اس قانون کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکے اور اسے محض ایک اتفاق قرار دیتے ہیں

اب ہم چار ارضی سیاروں TERRESTRIAL PLANETS کے متعلق جو کچھ آج تک معلوم ہوا ہے۔ مختصراً اس پر بحث کریں گے۔ سب سے پہلے ہم عطارد (MERCURY) کو لیں گے۔ یہ سب سے اندرونی سیارہ ہے اس کی زیادہ سے زیادہ ELONGATION 28° ہے۔ اس لئے یہ ہمیشہ سورج کے بہت قریب رہتا ہے۔ اس کا سورج سے فاصلہ 0.387 فلکیاتی اکائیاں ہے یہ اپنے محور اور سورج کے گرد ۸۸ دنوں میں ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ اس کا قطر ۳۰۰۰ میل ہے یہ پلوٹو کو چھوڑ کر باقی سب سیاروں سے چھوٹا ہے اس کا حجم زمین کے حجم سے اٹھارہواں حصہ ہے اس کی سطح پر کشش ثقل زمین کی نسبت ۳/۸ ہے۔ یہ اپنے اوپر پڑنے والی سورج کی روشنی کا ۹۳ فی صد جذب کر لیتا اور صرف ، فی صد منعکس کرتا ہے۔ اس طرح ہم کہتے ہیں کہ اس کی استعداد انعکاس صرف ، فی صد ہے۔ اس استعداد انعکاس کو ALBEDO کہتے ہیں۔

سورج کے بہت قریب ہونے کی وجہ سے اس سیارے کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا جا سکا۔ تاہم بعض ہیئت دانوں نے اس کی سطح پر مختلف اقسام کے دھبے دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ سورج کے گرد گردش کرتے وقت عطارد چاند کی طرح اپنی شکل بدلتا ہے۔ یعنی "ہلال" سے "بدر" اور "بدر" سے ہلال بنتا رہتا ہے۔ مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سیارے کے گرد زمین کی طرح کا کوئی چاند (SETELLITE) گردش نہیں کرتا۔

فضا اور طبعی حالات:۔ مختلف تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ عطارد کے گرد کوئی فضا نہیں ہے اور خصوصاً وہاں آکسیجن اور آبی بخارات کا نام تک نہیں۔ بعض مشاہدات یہ بھی کہتے ہیں کہ عطارد کی فضا کسی نامعلوم سے بہت ہی لطیف مادے پر مشتمل ہے جس میں گرد کے ہلکے ہلکے طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ عطارد سورج کے قریب ہونے کی وجہ سے زمین کی نسبت فی مربع گز سات گنا زیادہ حرارت اور روشنی وصول کرتا ہے اس کی سطح پر درجہ حرارت ۳۰۰ درجے سے ۵۰۰ درجے سنٹی گریڈ تک ہے۔

TRANSITS: بعض کبھی جب یہ سیارہ گردش کرتے کرتے سورج اور زمین کے عین درمیان آ جاتا ہے تو اس کو سورج کے قرص پر دوربین سے دیکھا جا سکتا ہے اس عمل کو ٹرانزٹ TRANSIT یا عبور کہتے ہیں۔ اس عمل کے دوران یہ ۱۲ انچ قطر کی ایک چھوٹی سی سیاہ پلیٹ کی طرح نظر آتا ہے اسے اس حالت میں ۱۲ نومبر ۱۹۴۰ اور ۱۴ نومبر ۱۹۵۳ اور ۶ مئی ۱۹۵۷ کو دیکھا گیا۔

دوسرا درمیانی سیارہ زہرہ (VENUS) ہے۔ اس کا سورج سے فاصلہ ۰.۷۲۳ فلکی اکائیاں ہے یہ سورج کے گرد ۲۲۵ دنوں اور اپنے محور کے گرد ۲۴ سے ۲۲۵ دنوں میں ایک چکر مکمل کرتا ہے اس کی زیادہ سے زیادہ [illegible] یا کھنچاؤ ۴.۶ دیکھی ہے۔ اس کا قطر ۷۵۸۴ میل ہے۔ یعنی تقریباً زمین کے قطر کے برابر۔ اس کا وزن زمین کے وزن کا ۰.۸۲ ہے اس کی اوسط کثافتِ اضافی ۵.۲ ہے۔ اس کی کششِ ثقل زمین کی کششِ ثقل کا ۰.۸۵ حصہ ہے زہرہ تمام سیاروں سے زیادہ روشن ہے۔ یہ سورج سے آنے والی روشنی کا ۵۹ فی صد حصہ منعکس کرتا ہے یہ اتنا روشن ہے۔ بعض دفعہ دن کے وقت بھی دکھائی دیتا ہے اور جب رات کو یہ افق پر ظاہر ہوتا ہے تو زمین پر اس کی وجہ سے درختوں اور مکانوں وغیرہ کے سائے بنتے ہیں

دوربینی مشاہدہ سے پتہ چلتا ہے کہ سورج کے گرد گردش کے دوران یہ بھی ہمارے چاند کی طرح گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ دوربین سے دیکھنے سے یہ سیارہ ایک نہایت چمکدار پلیٹ کی صورت میں نظر آتا ہے جس کی سطح پر کبھی کبھی گدلے رنگ کے بادل سے اٹھتے رہتے ہیں۔ فضا (ATMOSPHERE) سائنسدانوں نے مختلف مشاہدات سے اندازہ لگایا ہے کہ زہرہ کی فضا میں ہر وقت ایک خاص قسم کے گرد کے بادل چھائے رہتے ہیں کئی سال پہلے ہیئت دانوں نے زہرہ کے گرد ایک سرخ رنگ کا بادل مشاہدہ کیا تھا جو اندازاً ساٹھ سو میل لمبا بتلایا گیا تھا۔ یہ ثابت ہوا ہے کہ زہرہ کی فضا میں آبی بخارات یا آکسیجن نام کو نہیں ہے۔

طبعی حالات:۔ زہرہ پر زمین کی نسبت دوگنا حرارت اور روشنی پڑتی ہے اس کے باوجود زہرہ کی سطح کا درجہ حرارت

منفی ۴۵ درجے سنٹی گریڈ رہتا ہے سائنس داں اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ سورج کی طرف سے آنے والی حرارت کا بیشتر حصّہ سیارہ کے گرداگرد واقع خاص قسم کے گرد کے بادل جذب کر لیتے ہیں۔ عبور (TRANSITS) یا عبور کا۔ زہرہ کا عبور شاذونادر ہی ہوتا ہے اس کے آخری دو عبور ۹ دسمبر ۱۸۷۴ء اور ۶ دسمبر ۱۸۸۲ء کو واقع ہوئے تھے اور آئندہ بھی ۸ جون ۲۰۰۴ء اور ۶ جون ۲۰۱۲ء کو ہونے کا امکان ہے۔

چاند یا سٹلائٹ (STELLITES):۔ زہرہ کے گرد کوئی چاند گردش نہیں کرتا اور اگر کوئی یا کچھ گردش کرتے بھی ہیں تو وہ اس قدر چھوٹے ہیں کہ زمین سے نظر نہیں آتے سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں کچھ ہیئت دانوں نے دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے زہرہ کے گرد ایک کافی بڑا چاند دیکھا ہے لیکن چونکہ پچھلے ڈیڑھ سو سال کے دوران ایسا کوئی چاند نہیں دیکھا گیا اس لیے خیال ہے کہ ان کو غلطی لگی تھی۔

ارضی سیاروں (TERESTRIAL PLANETS) میں تیسرے نمبر پر خود ہماری زمین آتی ہے جس کے متعلق ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے چھوڑ کر چوتھے ارضی سیارے مریخ (MARS) کو لیتے ہیں۔ مریخ کا مدار زمین کے مدار سے باہر کی طرف واقع ہے۔ سورج سے اس کا فاصلہ ۱.۵۲ فلکیاتی اکائیاں ہے یعنی اس کا فاصلہ زمین کے فاصلے کی نسبت ڈیڑھ گنا سے ذرا زیادہ ہے۔ اس کی سورج کے گرد گردش کا وقت ۶۸۷ دن اور گردشِ محوری کا وقت ایک دن ہے اس کا اوسط قطر ۴۲۰۰ میل ہے۔ یہ قطبین پر زمین کی طرح چپٹا ہے اس کا وزن زمین کی نسبت سے ۰.۱۰۸ ہے اور اس کی کثافتِ اضافی ۳.۹ ہے۔ اس کی کشش ثقل ۰.۳۸ ہے یعنی اگر ایک چیز کا وزن زمین پر ۱۰۰ پونڈ ہو تو مریخ پر اس چیز کا وزن ۳۸ پونڈ ہوگا۔ مریخ کی استعدادِ انعکاس (ALBEDO) پندرہ ہے۔ یعنی یہ سورج سے آنے والی روشنی کا پندرہ فی صد حصہ منعکس کرتا ہے لعض دفعہ جب یہ زمین سے بہت قریب ہوتا ہے تو زہرہ کے بعد سب سے زیادہ درخشندہ سیارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس سیارہ کو ماہرینِ فلکیات صدیوں سے مشاہدہ کرتے چلے آرہے ہیں کیونکہ اس کی سطح پر بعض نہایت واضح مستقل اور عجیب و غریب، زمین کی سطح سے ملتے جلتے نشانات پائے گئے ہیں۔ ان ہی نشانات کی مدد سے اس کی گردشِ محوری بھی نہایت صحت کے ساتھ ماپی گئی ہے جو کہ ٹھیک ۲۴ گھنٹے ۳۷ منٹ اور ۲۲.۶ سیکنڈ بنتی ہے۔ یعنی یہ سیارہ اپنے محور کے گرد تقریباً اتنے ہی وقت میں ایک چکر مکمل کرتا ہے جتنے وقت میں کہ زمین اپنے محور کے گرد۔ فضا (ATMOSPHERE) مریخ کی فضا مقابلتاً لطیف ہے۔ اس کی فضاؤں میں کبھی کبھی گرد کے بادل سے اٹھتے دیکھے گئے ہیں لیکن یقین سے کہا نہیں جاسکتا کہ آیا یہ بادل گرد کے ہیں یا آبی بخارات کے ۱۹۰۸ء میں دکاایم سلیپر ایک ماہر فلکیات نے اپنے مشاہدوں کی بنا پر دعویٰ کیا تھا کہ مریخ کی فضا میں بہت تھوڑی سی مقدار میں آبی بخارات اور آکسیجن موجود ہیں لیکن حالیہ ہی میں دو ماہرینِ فلکیات آدمز (ADAMS) اور ڈن ہام (DUNHAM) نے اپنے جدید ترین آلات کی مدد سے اس دعوے کی تردید کی ہے ان کا

دعویٰ ہے کہ ان کے آلات اس قدر حساس ہیں کہ اگر مریخ کی فضا میں زمین کی نسبت ہزارواں حصہ بھی آکسیجن ہوتی تو وہ اس کی خبر دے سکتے ہیں ــــــ قطبی نقاب (POLAR CAPS) مریخ کی سطح پر سب سے زیادہ قابل توجہ چیز اس کے قطبین پر سفید رنگ کے علاقے یا خطے ہیں۔ جن کے پھیلاؤ میں موسم کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی رہتی ہے جب مریخ کے شمالی نصف کرّے میں بہار یا گرمی کا موسم ہوتا ہے تو شمالی قطبیہ کا سفید نقاب تیزی سے سکڑتا ہے جب کہ جنوبی قطب کے نقاب میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جب مریخ کے جنوبی نصف کرہ میں گرمی کا موسم ہوتا ہے تو جنوبی قطب کا نقاب سکڑ جاتا ہے اور شمالی قطب کا نقاب پھیل جاتا ہے۔ جب مریخ زمین سے قریب ترین فاصلے پر ہوتا ہے تو اس کا جنوبی قطب ہماری طرف ہوتا ہے چنانچہ اس کے جنوبی قطب کا زیادہ گہرا مطالعہ کیا جا چکا ہے۔ قطبی نقابوں (POLAR CAPS) کا باری باری موسم کے ساتھ گھٹنا اور بڑھنا اس بات کی دلیل ہو سکتا ہے کہ یہ قطبی نقاب دراصل برف کے بہت بڑے بڑے ذخیرے ہیں بالکل اسی طرح کہ جس طرح کے کہ زمین کے قطبین پر پائے جاتے ہیں اور جو کہ گرمیوں یا بہار کے موسم میں سکڑتے رہتے ہیں۔

درجۂ حرارت:۔ مریخ کے درجۂ حرارت کے متعلق تا حال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم لوویل (امریکہ) کی رصدگاہ کے دو ماہرین کوبلنز اور لیمپ لینڈ نے ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیانی عرصے میں مریخ کے درجۂ حرارت کے متعلق جو خصوصی تحقیقات اور مشاہدات کئے۔ ان سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ جن کی اور بھی بہت سے ماہرین نے تصدیق کی ہے۔

(i) قطب جنوبی کا درجۂ حرارت صفر درجے سے ۲۰ درجے سنٹی گریڈ تک۔

(ii) جنوبی خطوں کا درجۂ حرارت ۰۷ درجے سے ۳۰ درجے سنٹی گریڈ تک

(iii) درمیانی خطے ۳۰ درجے سے ۴۰ درجے سنٹی گریڈ تک

(iv) شمالی خطے ۱۵ درجے سے ۲۵ درجے سنٹی گریڈ تک

(v) قطب شمالی −۱۵ درجے سے ۳۰ درجے سنٹی گریڈ تک

(vi) مشرقی خطے −۱۰ درجے اور مغربی خطے ۲۰ درجے سنٹی گریڈ تک

مریخ کا جب کوئی علاقہ ابر آلود ہو تو اس کا درجۂ حرارت پندرہ سے تیس درجے تک نیچے گر جاتا ہے۔

سطحی رنگ: (SURFACE COLOURS) قطبی علاقوں کو چھوڑ کر مریخ کی باقی سطح دو رنگی ہے کچھ سُرخی مائل زرد اور کچھ نیلی سبز پہلے پہل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زرد رنگ کے علاقے خشک میدان ہیں اور سبز رنگ کے علاقے سمندری علاقے ہیں۔ لیکن جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ سبز رنگ کے حصے پانی کے سمندر نہیں بلکہ کچھ اور چیز ہے اگرچہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ سب رنگ کیا اور کیوں ہیں تاہم غالب گمان یہ ہے کہ ان سب سبز رنگ کے علاقوں میں جنگل اور سبزہ زار ہیں اور زرد رنگ کے علاقے صحرائی علاقے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق بڑے زور شور سے ہو رہی ہے۔ کیونکہ اگر یہ نظریہ ثابت ہو گیا تو اس خیال کی قریب قریب تصدیق ہو جائے گی کہ مریخ پر زندگی پائی جاتی ہے ــــــ مریخی نہریں: ۱۸۷۷ء میں شیاپریلی ایک ماہر فلکیات نے اعلان کیا

کہ اس نے مریخ کے زرد رنگ کے علاقوں میں کچھ باریک باریک سی لکیریں دیکھی ہیں۔ پھر ۱۸۸۱ء میں اس نے اعلان کیا کہ ان لکیروں میں سے بہت سی پہلے اکیلی اکیلی تھیں لیکن بعد میں ایک ایک سے دو دو ہو گئیں ان لکیروں کا نام اس نے CANALS یعنی نہریں رکھا۔ اس کے بعد سے متعدد ماہرین نے ان لکیروں کی موجودگی کی خبر دی ہے۔ امریکہ میں لویل کی رصدگاہ والوں نے بتایا کہ مریخ کی سطح پر اس قسم کی سینکڑوں لکیریں موجود ہیں۔ فلکیات کے بعض ماہرین جنہوں نے مریخ کا مطالعہ کیا ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس قسم کی لکیروں کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ لہذا یہ اتنی قابل توجہ نہیں ہیں جتنی کہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ لکیریں دراصل کئی میل چوڑے اور ہزاروں میل لمبے کھڈ ہیں جو کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر مریخ کی سطح پر بن گئے ہیں ممکن ہے کسی زمانے میں یہاں سے دریا بہتے رہے ہوں۔ لیکن اب سوکھ چکے ہوں تاہم ان لکیروں یا کھڈوں کا بغور مطالعہ جاری ہے۔ ممکن ہے کسی آنے والے وقت میں جب اور زیادہ طاقتور دوربین ایجاد ہو جائیں تو کوئی نیا دلچسپ انکشاف ہو فی الحال تو مختلف نظریات کی حیثیت مفروضوں سے زیادہ کچھ نہیں ——— مریخ پر زندگی؟ آجکل قریباً ہر متجسس ذہن میں یہ سوال گونج رہا ہے کہ کیا واقعی مریخ پر کوئی ذہین مخلوق آباد ہے! اور کیا واقعی مریخ پر زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں! ——— جہاں تک زندگی کا تعلق ہے اس میں تو اب قریباً قریباً کوئی شک باقی نہیں رہا کہ مریخ پر (نباتات کی شکل میں) زندگی موجود ہے۔ موسموں کے ساتھ سیارے کی سطح کے رنگ میں تبدیلی اس بات کی قطعی دلیل ہے! لیکن ہمارے پاس فی الحال کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے ہم یہ دیکھ سکیں کہ یہ نباتات چھوٹی جھاڑیوں اور جڑی بوٹیوں کی شکل میں ہے یا بڑے بڑے تناور درختوں کی صورت میں ——— دیکھئے اگر مریخ پر نباتاتی زندگی موجود ہے تو بعید نہیں کہ وہاں ادنیٰ درجہ کی (چوہوں، چھپکلیوں یا کیڑوں مکوڑوں کی شکل میں) حیوانی زندگی بھی موجود ہو۔ اور جہاں تک "ذہین مخلوق" یا دوسرے الفاظ میں انسانی آبادی کا سوال ہے مندرجہ ذیل تفصیل سے اس کی کچھ وضاحت ہو سکتی ہے:۔ مریخ کی سطح پر دیکھی گئی باریک لکیروں کے متعلق ماہرین فلکیات کے دو مختلف نظریات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ایک وہ جس میں ان لکیروں کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور ان سے بہت قیمتی انکشافات کی توقع رکھی گئی ہے اور دوسرا وہ جن میں ان کو بڑے بڑے وسیع کھڈ یا کسی زمانے میں بہنے والے دریاؤں کی خشک شدہ گزرگاہیں (جو صرف زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے باریک لکیروں کی صورت میں نظر آتی ہیں) سمجھ کر نا قابل توجہ قرار دیا گیا ہے اگر ان دونوں میں سے پہلے نظریئے کو درست مان لیا جائے تو بات کچھ یوں بنے گی کہ کسی قسم کے قدرتی نظام میں کسی قسم کی باقاعدہ اور سیدھی لکیریں کبھی مشاہدے میں نہیں آئیں اور زمین پر انسان کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہمیشہ انسان ہی مختلف قسم کے لیے منصوبہ بناتا ہے کہ جن میں باقاعدہ سیدھی لکیروں کی قسم کی چیزیں آسکتی ہیں (مثلاً ریلوے لائن، نہریں اور سڑکیں وغیرہ) پس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جو مریخ پر باقاعدہ قسم کی سیدھی لکیریں پائی گئی ہیں یہ کسی مصنوعی نظام کا حصہ ہیں۔ نہ کہ کسی قدرتی نظام کا! اور چونکہ ایسے منصوبے صرف اور صرف ذہین مخلوق یا دوسرے الفاظ میں انسان ہی بنا سکتا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ مریخ پر انسانی آبادی کا وجود ہے!۔ اب اس کے متعلق بھی مختلف نظریات ہیں کہ یہ سیدھی لکیریں اگر کسی مصنوعی نظام کا ہی حصہ ہیں تو بھی در اصل یہ ہیں کیا! تو اس کے متعلق ایک امکان یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے یہ لکیریں وہ نہریں ہوں جو مریخی انسان مریخ کے باقی علاقوں میں پانی نہ ہونے کی وجہ سے قطبین سے جہاں کافی مقداریں برف اور پانی موجود ہوتا ہے نکال کر خشک علاقوں (باقی صفحہ ۶۲ پر)

اکبر علی ہاجرہ
بی ایس سی سال دوم

سانپ

ٹھہرے دار ساخت والے تمام جانوروں میں سے انسان غالباً سب سے زیادہ نفرت سانپ سے کرتا ہے اس کی بڑی وجہ سانپ کی پُراسرار ریت اور پھر اس کا زہر ہے جو نہایت سُرعت کے ساتھ انسانی جسم میں سرایت کرتا اور اسے موت کی نیند سُلا دیتا ہے۔ آج کل اگرچہ اس کے کچھ علاج بھی دریافت کئے جا چکے ہیں۔ پھر بھی سانپ کے کاٹے ہوئے اسّی نوّے فیصد لوگ عموماً مر جاتے ہیں۔ کیونکہ سانپ کے کاٹنے کے بعد طبّی امداد میں دو منٹ کی تاخیر بھی ناقابلِ تلافی ہوتی ہے اور انسان موت کے منہ میں جانے سے نہیں بچ سکتا ۔ لیکن سانپ سے جہاں ایک ہمہ گیر خوف سا پایا جاتا ہے۔ وہاں ہم میں سے بہت کم کو اس حقیقت کا علم ہے کہ سانپ کی بیشتر اقسام بے ضرر ہیں یعنی ان میں زہر نہیں ہوتا اور وہ صرف نام کے سانپ ہوتے ہیں۔

خیال ہے کہ سانپ کی کم و بیش بائیس سو اقسام ہیں اور یہ آج سے قریباً اسّی ملین سال (آٹھ کروڑ سال) پہلے بغیر آنکھوں والی زیرِ زمین رہنے والی خاص قسم کی چھپکلیوں سے ارتقا پذیر ہوئے ہیں

سانپوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۱۔ زہریلے سانپ ۲۔ بے ضرر سانپ۔

زہریلے سانپ

اس گروہ میں وائپرز (VIPERS) یا افعی، کریٹ (KRAIT) پھنیر اور کوبرا (COBRA) وغیرہ اقسام کے سانپ شامل ہیں۔ قریباً تمام زہریلے سانپوں کی پہچان یہ ہے کہ ان کے پیٹ کے اگلے حصہ پر (جسے سینہ کہا جا سکتا ہے) گول قرص نما نشانات ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام زہریلے سانپوں کے اوپر کے جبڑے میں سامنے کی طرف ایک سے لے کر چار تک بل کھائے ہوئے دانت ہوتے ہیں۔ جب کہ بے ضرر سانپوں کے اوپر کے جبڑے میں سیدھے دانتوں کی ایک قطار ہوتی ہے۔ زہریلے سانپوں کے "تالو" میں زہر کے غدود ہوتے ہیں۔ جن کو زہر کی تھیلیاں کہتے ہیں۔ ان تھیلیوں کا تعلق سانپ کے ڈسنے والے دانتوں سے ہوتا ہے۔ ان میں ہر ایک کے ساتھ ایک سپرنگ نما عضلہ سا ہوتا ہے۔ جب سانپ ڈستا ہے تو یہ عضلہ سُکڑ جاتا ہے۔ جس کے دباؤ کی وجہ سے زہر تھیلی سے نکل کر بل کھائے دانتوں کے ذریعے جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں (باقی صـ۶۴ پر)

گلہائے رنگارنگ

- بدر منیر
- محمد انور قریشی

بدر منیر بی اے

اور ——— اشک بہتے رہے

برسات کا موسم تھا۔ بادل جھوم جھوم کر آ رہے تھے۔ کبھی موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی اور کبھی بوندا باندی بادلوں کے گرجنے کی آوازوں سے دل دہل رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں قریب ہی بجلی گری ہے۔ موسم کی ناخوشگواری نے اردگرد کے ماحول کو بھی ناخوشگوار بنا رکھا تھا۔ ایسے میں ایک دوشیزہ رب العزت کے حضور سجدہ ریز تھی اور دعا مانگ رہی تھی "اے خدا! میں تیری ناچیز بندی تیری بارگاہ میں اس جذبے سے حاضر ہوئی ہوں کہ تو دعاؤں کو سنتا ہے اور اپنے بندوں کی تکالیف رفع کرتا ہے۔ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ اپنی دعاؤں کو تجھ تک پہنچا سکوں۔ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ سکون کی زندگی بسر کر سکوں ——— میں کسی کے لئے برائی نہیں چاہتی ——— اگر میرا وجود اس دنیا میں کسی کے لئے باعث زحمت ہے تو بے شک تو مجھے موت دے دے —— میں نہیں چاہتی کہ میرے باعث کسی کو معمولی سی بھی تکلیف پہنچے ——— تو میری اس سوتیلی والدہ کو سلامت رکھ، اور لمبی عمر عطا فرما۔ تاکہ اس کے بچے ممتا جیسی نعمت سے محروم نہ ہو جائیں۔ گو میری اپنی ماں زندہ ہے مگر تو نے مجھے اس کے پیار اور محبت سے محروم کر رکھا ہے ——— میں حقیر ناچیز بندی تیری قدرت کے سامنے کوئی بات کہنے کی مجال نہیں رکھتی —— تو جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ تو اس سوتیلی والدہ کو ہدایت نصیب کر تاکہ وہ ہمارے وجود کو ایک انسانی وجود سمجھ کر ہم سے ماں جیسا سلوک کر سکے ———
اے خدا! —— اے میرے رحیم و کریم خدا! ——— تو ہماری مشکلات دور فرما، اور ہمارے لئے کوئی بہتر راہ پیدا کر ———"

تزئین نے دعا ختم کی، کمرے سے باہر جھانکا تو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی جاری تھی باورچی خانے میں پہنچی اور کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی، آنکھوں سے اشک بہے جا رہے تھے اور زبان خدا کی حمد میں مصروف تھی —— اس گھر میں کون تھا جو اس کی دلجوئی کرتا —— کون تھا جو اس کا سہارا بنتا —— ماں کی ممتا بچپن میں ہی اس سے چھن چکی تھی —— سوتیلی والدہ نے گھر میں قدم رکھتے ہی ان دونوں بہنوں کا جینا حرام

کردیا ـــــ بات بات پہ نکتہ چینی ، قدم قدم پہ لعن طعن ـــ غرضیکہ اُن پہ ہر قسم کا ستم روا رکھنے مگر کیا مجال کہ ان بیچاریوں کی زبان پہ کوئی لفظ آ جائے اور وہ ظالم ماں کے سامنے کچھ کہہ دیں۔ ان کے قول کو گلے شکوے قرار دیا جاتا ہے۔ اُن کے فعل کو نازیبا اور غیر مہذبانہ قرار دیا جاتا۔ بہر حال ان کی گھر میں موجودگی اُسے کانٹا محسوس ہو رہی تھی ـــ خدا کے فضل سے خود بھی چھ بچوں کی ماں تھی۔ اُن سے ہر قسم کا پیار اور لاڈ روا رکھتی ہے ـــ کھانے کو اچھا، پہننے کو ستھرا ـــــ غرضیکہ ہر لحاظ سے اور ہر پہلو سے اُن پہ جان چھڑکتی مگر جونہی اس کی نظر اُن مظلوم بے بس بہنوں پہ پڑتی ، آنکھوں سے آگ کے شرارے برسنے شروع ہو جاتے۔ یوں معلوم ہوتا گویا انہیں پل بھر میں بھسم کر جائے گی۔ کاش ! اگر اس کے جسم میں ممتا کا جذبہ موجود نہ تھا تو حقوق العباد کا لحاظ ہی ہوتا اور وہ انہیں انسان تصور کرتے ہوئے انسانوں جیسا سلوک ہی کر سکتی ـــ سچ ہے خدا تعالیٰ کسی کا سوتیلی ماں سے واسطہ نہ ڈالے ـــــ

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

وقت گزرتا رہا۔ حالات بدلتے رہے۔ مگر گھر کے ماحول اور سوتیلی ماں کے رویہ میں قطعاً فرق نہ آیا۔ تنویر اور نسرین زندگی کے دن گن گن کر گزارتی رہیں۔ عورت ذات ہونے کی حیثیت سے گھر سے بغاوت بھی ممکن نہ تھی۔ رشتہ دار میں سے کوئی ایسا ہمدرد بھی نہ تھا جو ظالم ماں کے ظالم پنجہ سے چھڑا کر آزادی کا سانس نصیب کرتا۔ یہ باپ کا گھر تھا اور باپ سے بڑھ کر کون ہمدرد ہو سکتا تھا۔ مگر حالات کچھ اور ہی رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ ماں کی چکنی چپڑی باتیں اسے اپنا گرویدہ بنا چکی تھیں۔ اور ہر موقعہ پہ وہ انہیں کو قصوروار قرار دیتا۔

نسرین عمر میں چھوٹی تھی اور وہ اکثر ماں کے خوف سے سہمی سہمی سی رہتی۔ آنکھیں ہر وقت پرنم اور چہرہ اترا اترا سا رہتا ـــ کاش کوئی ایسا لمحہ بھی ہوتا جب مسکراہٹ اُن کے چہرہ پہ نمایاں ہو سکتی۔ مگر کہاں وہ دو بدنصیب اور کہاں مسکراہٹ ـــــ!

تنویر اپنی چھوٹی بہن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اکثر دل برداشتہ ہو جاتی اور خود بھی بھر آتی۔ بے اختیار دونوں آہوں اور سسکیوں میں کھو جاتیں۔ بعض اوقات ایک آدھ سسکی کمرے سے ابھرتی اور فضا کو مکدر اور افسردہ بنا دیتی۔ سوتیلی ماں ـــ جو بڑی بی کے نام سے مشہور تھی ان کی سسکیاں سنتے ہی کمرہ میں پہنچتی اور اپنی بے لگام اور خاصی دراز زبان سے وہ تبرے چھوڑتی کہ توبہ بھلی ـــ !

"یہ کس کا سوگ منا رہی ہو کم بختو ! خدا تمہیں موت دے ـــ کیوں میرا جینا محال کر رکھا ہے تم نے

دھندوں سے جان چھڑانے کی خاطر اندر آ کر رونا شروع کر دیتی ہیں ـــــــ ادھر تمہارے باپ نے گھر کا کام کرنا ہے ــ باپ سے کیوں نہیں کہتی ہو کہ ایک علیحدہ بنگلہ بنا کر دے ــ اور نوکرانیاں مہیا کرے ــ آنے دو تمہارے باپ کو ابھی ٹھیک کرواتی ہوں ــ نالائق ــ بدبخت ــ حرام خور ــ" اور نجانے وہ کیا کیا کہتی گئی ــ یہ دونوں سنتی رہیں۔ آخر کر بھی کیا سکتی تھیں ــ اٹھتیں اور کام کاج میں مصروف ہو گئیں۔

شام کو ابا گھر آئے۔ نوبت شکایت تک پہنچی۔ پھر کیا ہوا ـــ! خوب پٹائی ہوئی۔ اور مزید لعن طعن کا شکار ہونا پڑا ــ خیال تھا کہ باپ سے اپنا دکھ درد کہہ سکیں گی۔ مگر حالات کا پانسہ پلٹا ہوا نظر آیا۔ ماں کی کہی ہوئی بات اس کے لیے خدائی حکم کی حیثیت رکھتی تھی۔

"اُف ـ ستم بالائے ستم ــ مادر تو درکنار باپ کا جذبۂ خون بھی ماند پڑ چکا ہے ـ"

بے اختیار تنویر کے لب ہلے اور وہ تصورات میں کھوئی کھوئی یوں گویا ہوئی ــ "ابا جان! ــ میں معافی چاہتی ہوں آئندہ شکایت کا موقعہ نہیں دوں گی ـ"

"میں روزانہ تمہاری شکایتیں سنتا ہوں۔ تم بہت لاپرواہ اور زبان دراز ہو۔ بس فیشن کرنا جانتی ہو ـ کیا تمہارا فرض نہیں کہ اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاؤ ــ الٹا اس سے جھگڑا کرتی ہو ــ اگر جان کی امان چاہتی ہو تو درست ہو جاؤ ــ ورنہ تمہاری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا ــ جاؤ ــ دور ہو جاؤ میری آنکھوں سے ــ نالائق کم عقل ــ بے شرم ــ" والد بڑبڑاتا ہوا سائیکل پکڑ کر باہر چلا گیا۔ اور دو مجسم روحیں آنکھوں میں آنسو لیے ایک دوسرے کا منہ تکتی رہ گئیں ـــــــ

موسم آج بھی خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔ اچانک بادل گرجے اور فضا کو مکدر کر گئے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

"کاش! ــ یہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں ــ"

تنویر نے ایک سرد آہ کھینچ کر کہا اور جلدی سے باورچی خانے کی طرف بڑھی اور کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی ـــــــ اور پھر زلزلہ آ گیا ـــــــ

محمد انور قریشی
بی اے سال دوم

صفراوی دوا

(تمام نام اور واقعات فرضی ہیں۔ مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی)

ہمارے محلہ میں ایک صاحب گل محمد مخدوم نام رہتے ہیں۔ وہ خود تو کم ہی نظر آتے ہیں لیکن ان کے مکان کی دیوار پہ لگے بڑے بورڈ "صفراوی دوا" پر ہر آنے جانے والے کی نظر پڑتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب ہم نے "روزنامہ کھٹر کن" میں اس دوا کا اشتہار پڑھا تو اس کے خواص کے ضمن میں لکھا تھا کہ یہ دوا حبس، اپھارہ، یرقان اور متلی کے لئے اکسیر ہے اور کھٹی ڈکاروں کے لئے تو مجرب ہے۔ ان بیماریوں کے نام پڑھ کر اپنی تو طبیعت خراب ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد جب پھر بورڈ "صفراوی دوا" دکھائی دیا تو ہمیں قے ہوگئی اس کے بعد تو جب بھی ہم ادھر سے گزرتے ہیں اور بورڈ پہ نظر پڑتی ہے تو ابکائی سی آجاتی ہے۔ کوئی ان صاحب سے پوچھے کہ اے بندۂ خدا ایک تو دوا عجیب و غریب اور بھیانک امراض کے لئے ہے اور دوسرے اس کا نام صفراوی دوا رکھا ہے۔ یہ ہمارے کس جرم کی سزا دے رہے ہو؟ چلئے اگر اسے کوئی اور نام دے دیتے تو پھر بھی شاید ہم اسے قبول کر لیتے لیکن صفراوی دوا . . . .

اوں . . . آں . . . . آؤں . . . . (قے)

مصیبت یہ ہے کہ ان صاحب کا مکان ہمارے راستہ میں واقع ہے اور بازار جانے کے لئے دوسرا راستہ بہت لمبا ہے۔ ہم نے کئی بار اس بورڈ سے نظر بچا کر گزرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن نظر غیر ارادی طور پہ ادھر ہی اٹھ جاتی ہے۔ ایک دفعہ تنگ آکر ہم نے راستہ بھی تبدیل کیا۔ لیکن گھر میں اگر کوئی مہمان آجاتا یا کسی اور ضروری کام کے لئے جلدی بازار جانا ہوتا تو ادھر سے ہی گزرنا پڑتا۔ عجیب حالت تھی ہم بورڈ کی طرف نہ بھی دیکھتے تو وہ خود بخود ہی نظروں کے سامنے آجاتا اور سارا راستہ وہی ذہن پہ سوار رہتا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے

مصداق ہم نے دوستوں کے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اس بورڈ کو ہی اکھاڑ دیا جائے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ بورڈ خاصہ اونچا تھا اور بہت مضبوطی سے لگا ہوا تھا۔ ایک دن ہمارے ایک دوست ——— خدا انہیں جزائے خیر دے ——— کے ذہن میں خیال آیا کہ اسے کسی لاٹھی وغیرہ کے ذریعہ دوسرا کر دیا جائے۔ رٹین کا یہ بورڈ مکان کے کونے پر اس طرح لگا ہوا ہے کہ آدھا دیوار کے ساتھ ہے اور آدھا اس سے الگ۔ چنانچہ ہم موقع کی تلاش میں رہے۔ سردیوں کے دن تھے اور لوگ کمروں میں سوتے تھے۔ ہم نے سوچا کہ رات کو پچھلے پہر جب گھر والے سو جائیں تو ہم اپنا کام کریں۔ لیکن ادھر ایک دقت یہ بھی تھی کہ ۹ بجے کے بعد ہمیں گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ آخر ایک روز ہم نے کسی نہ کسی بہانے محترم والد صاحب سے اجازت حاصل کر لی اور اپنے دوستوں کو لے کر اس عظیم مہم پر روانہ ہو گئے۔ وہاں ہم نے اس بورڈ کو دہرا کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ بہت لچکدار ثابت ہوا۔ اس کام میں کچھ شور بھی پیدا ہوا اور ہم ڈر کر بھاگ آئے ——— ابھی یہ چکر چل ہی رہا تھا کہ ہمارے دستِ راست "مبارک" ہمدرد کے سلسلہ میں باہر چلے گئے اور اسی اثناء میں مخدوم صاحب نے بورڈ پر روغن کرا کے اسے دوبالہ لکھوا لیا کیونکہ ہماری زور آزمائی کے دوران اس کی کچھ پالش اتر گئی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ مخدوم صاحب نے اس بورڈ کے عین اوپر ایک بلب لگوا دیا۔ یہ گویا ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے مترادف تھا۔ دن کے وقت تو تکلیف تھی ہی اب رات کا چین بھی اڑ گیا۔ خوش قسمتی سے ہمارے اس دوست کو سروس مل گئی اور وہ جلد ہی واپس آ گئے۔ اور ہم نے پہلے سے بھی زیادہ زور و شور سے اپنی مہم شروع کر دی۔ تمام دوستوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی اور اس میں اس اہم معاملہ پر غور و خوض کیا گیا۔ اس میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا کہ بورڈ پر کولتار پھیر دی جائے۔ چنانچہ اس وقت سے ہم کولتار کی تلاش میں ہیں۔ پہلے تو یہ سڑکوں کے کناروں پر عام مل جایا کرتی تھی لیکن "روڈ پالیسی کمیٹی" کی سفارشات کے بعد یہ وہاں سے ہٹا دی گئی ہے۔ اب اس کے لئے ہم نے اپنے چھوٹے بھائیوں کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ امید ہے کہ اگر اس کا انتظام ہو گیا تو اس آفتِ جان سے کم از کم عارضی طور پر تو نجات مل سکے گی۔ ورنہ ہم تو مایوس ہو چکے ہیں اور ہمیں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بورڈ ہمیشہ ہی قائم رہے گا۔ کبھی دل میں آتا ہے کہ ان صاحب سے صاف صاف کہہ دوں کہ اجی حضرت اس بورڈ کو ہٹائیں ورنہ اگر ہمیں کچھ ہو گیا تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی بہرحال اس دردِ سری سے نجات کی کوئی صورت اگر کسی کے ذہن

مصداق ہم نے دوستوں کے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اس بورڈ کو ہی اکھاڑ دیا جائے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ بورڈ خاصہ اونچا تھا اور بہت مضبوطی سے لگا ہوا تھا۔ ایک دن ہمارے ایک دوست ——— خدا انہیں جزائے خیر دے ——— کے ذہن میں خیال آیا کہ اسے کسی لاٹھی وغیرہ کے ذریعہ دوہرا کر دیا جائے (چونکہ یہ بورڈ مکان کے کونے پر اس طرح لگا ہوا ہے کہ آدھا دیوار کے ساتھ ہے اور آدھا اس سے الگ) چنانچہ ہم موقع کی تلاش میں رہے۔ سردیوں کے دن تھے اور لوگ کمروں میں سوتے تھے۔ ہم نے سوچا کہ رات کو پچھلے پہر جب گھر والے سو جائیں تو ہم اپنا کام کریں۔ لیکن ادھر ایک دقت یہ بھی تھی کہ ۹ بجے کے بعد ہمیں گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ آخر ایک روز ہم نے کسی نہ کسی بہانے محترم والد صاحب سے اجازت حاصل کر لی اور اپنے دوستوں کو لے کر اس عظیم مہم پر روانہ ہو گئے۔ وہاں ہم نے اس بورڈ کو دہرا کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ بہت لچکدار ثابت ہوا۔ اس کام میں کچھ شور بھی پیدا ہوا اور ہم ڈر کر بھاگ آئے ——— ابھی یہ چکر چل ہی رہا تھا کہ ہمارے دست راست "مبارک" سروس کے سلسلہ میں باہر چلے گئے اور اسی اثناء میں مخدوم صاحب نے بورڈ پر روغن کرا کے اسے دوبارہ لکھوا لیا کیونکہ ہماری زور آزمائی کے دوران اس کی کچھ پالش اتر گئی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ مخدوم صاحب نے اس بورڈ کے عین اوپر ایک بلب لگوا دیا۔ یہ گویا ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے مترادف تھا۔ دن کے وقت تو تکلیف تھی ہی اب رات کا چین بھی اڑ گیا۔ خوش قسمتی سے ہمارے اس دوست کو سروس نہ ملی اور وہ جلد ہی واپس آ گئے۔ اور ہم نے پہلے سے بھی زیادہ زور و شور سے اپنی مہم شروع کر دی۔ تمام دوستوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی اور اس میں اس اہم معاملہ پر غور و خوض کیا گیا۔ اس میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا کہ بورڈ پر کولتار پھیر دی جائے۔ چنانچہ اس وقت سے ہم کولتار کی تلاش میں ہیں۔ پہلے تو یہ سڑکوں کے کناروں پر عام مل جایا کرتی تھی لیکن "روڈ پالیسی کمیٹی" کی سفارشات کے بعد یہ وہاں سے ہٹا دی گئی ہے۔ اب اس کے لئے ہم نے اپنے چھوٹے بھائیوں کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ امید ہے کہ اگر اس کا انتظام ہو گیا تو اس آفتِ جان سے کم از کم عارضی طور پر تو نجات مل سکے گی۔ ورنہ ہم تو مایوس ہو چکے ہیں اور ہمیں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بورڈ ہمیشہ ہی قائم رہے گا۔ کبھی دل میں آتا ہے کہ ان صاحب سے صاف صاف کہہ دوں کہ اجی حضرت اس بورڈ کو ہٹائیں ورنہ اگر ہمیں کچھ ہو گیا تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی بہرحال اس دردسری سے نجات کی کوئی صورت اگر کسی کے ذہن

میں ہو تو وہ ہمیں بتائیے ہم تاعمر اس کے احسان مند رہیں گے ۔

ویسے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تنظیم کے بعض خفیہ ممبر بھی ہیں جو کہ ہم سے زیادہ پرجوش اور عملی انسان واقع ہوئے ہیں کیونکہ بعض اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ بورڈ کچھ ٹیڑھا ہو جاتا ہے جس کو کہ گھر والے پھر سیدھا کر دیتے ہیں، اور آج کل بھی یہ ٹیڑھا ہے۔ اب اجازت دیں۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد اپنی طبیعت سخت خراب ہو چکی ہے۔ ہٹیئے ہٹیئے صاحب! ہمیں ابکائی آ رہی ہے ...

اول ... آل ... آؤں .... صفراوی دوا ...

ارضی سیارے بقیہ ص ۵۵

میں لے گئے ہوں تاکہ فصلوں وغیرہ کے کام آسکے!! بہر حال ہم تا حال اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے

مریخ کے چاند :-

مریخ کے دو چھوٹے چھوٹے چاند ہیں۔ جن کو ہال (HALL) نے ۱۸۷۷ء میں دریافت کیا تھا اندرونی چاند کا نام فوبوز (PHOBOS) اور بیرونی کا نام ڈیمیز (DEIMOS) رکھا گیا ہے۔ ان دونوں کے قطر اندازاً دس سے چالیس میل تک ہیں۔ ان میں سے ڈیمیز مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوتا ہے اور فوبوز مغرب سے طلوع ہو کر مشرق میں غروب ہوتا ہے ۔

سانپ بقیہ ص ۵۶

انسان کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔

سانپ کے کاٹے ہوئے انسان کے بچ نکلنے کے امکانات بہت تک دو چیزوں پر ہوتے ہیں۔ پہلی چیز زہر کی مقدار ہے جو کہ جسم میں داخل ہوتی ہے اور دوسری سانپ کے زہریلے دانتوں کی لمبائی اور وہ گہرائی ہے جہاں تک کہ وہ جسم کے اندر جاتے ہیں ——— ناگ قسم کا سانپ ایک محدود گنجائش کی زہر کی تھیلیاں رکھتا ہے اور اس کے زہریلے دانتوں کی لمبائی تین اعشاریہ پانچ ملی میٹر ہوتی ہے جبکہ ٹائیپان قسم کے سانپ کے دانت بارہ اعشاریہ پانچ ملی میٹر اور ایک پوری لمبائی (پانچ فٹ چھ انچ) کے وائپر یا افعی سانپ کے دانت ۲ انچ تک بھی لمبے ہو سکتے ہیں۔

(باقی)

شبستان غزل

- پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان
- عبدالسلام اختر ایم اے
- مبارک احمد عابد
- ہدایت اللہ ہادی
- لطیف گجراتی
- ایم رفیق ضیاء
- قمر کاشمیری

پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خاں

ہمدمو! چین کے دو لمحے غنیمت جانو!

غم کا پھر دل پہ میرے بارِ گراں ہے کہ جو تھا
آج بھی عشق وہی آفتِ جاں ہے کہ جو تھا

ہم نے گو لاکھ جلائے ہیں اُمیدوں کے چراغ
دل کی بستی کا وہی تیرہ جہاں ہے کہ جو تھا

اک حسیں یاد تری دل میں نہاں ہے کہ جو تھی!
اک حسیں نام ترا وردِ زباں ہے کہ جو تھا

بے خودی تو ہی بتا حُسن کے متوالوں کو!
جلوۂ آرا ابھی وہ راحتِ جاں ہے کہ جو تھا

اک خدا ہے کہ جو ہر لحظہ نئی شان میں ہے
اک یہ بندہ کہ وہی سوختہ جاں ہے کہ جو تھا

ہمدمو! چین کے دو لمحے غنیمت جانو!
برق رفتار جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

دے کے جاں ہم نے خریدا ہے غمِ ہر دو جہاں
تیری الفت میں وہی سود و زیاں ہے کہ جو تھا

ہم فقیرانہ صدا کر کے چلے سوئے عدم
آپ کا تو وہی آبادِ جہاں ہے کہ جو تھا

ہم نے سینچا تھا جسے خونِ تمنا سے نصیرؔ
غنچۂ دل وہی پامالِ خزاں ہے کہ جو تھا

عبدالسلام اختر
ایم اے

غزل

بشر تیری تجلّی کی حقیقت پا نہیں سکتا
نگاہوں میں کوئی تیرا تصور آ نہیں سکتا
رموزِ نظمِ قدرت آدمی سمجھا نہیں سکتا
عناصر کا معمہ کچھ سمجھ میں آ نہیں سکتا
یہ عاجز اب کوئی راحت نظر میں لا نہیں سکتا
کسی صورت میں ہو دنیا میں دھوکہ کھا نہیں سکتا
تکلم حدِ مجبوری ہے نوعِ بزمِ انساں کی
میں جو محسوس کرتا ہوں زباں تک لا نہیں سکتا
مری مجبوریوں کی لاج رکھ لے ساقیِ محفل
بھری محفل میں اپنے ہاتھ میں پھیلا نہیں سکتا
تمہاری رائے جو کچھ بھی ہو میرا تجربہ یہ ہے
سکوں اس دور میں دل کو میسر آ نہیں سکتا
قسم کھائیں اگر اہلِ سفینہ ڈوب جانے کی!
کوئی طوفاں سفینے کے مقابل آ نہیں سکتا

مبارک احمد عابد
(اورینٹل کالج لاہور)

غزل

سوزِ ہجر دل سے زہریلا ہے زہر یہ ایک جدائی کا
بزمِ نگاراں تیرے بِنا ہے ناگ شبِ تنہائی کا

دل والوں کے پیار کی دُنیا ڈوب گئی جن نینوں میں
لوگ بھی کچھ اندازہ کریں ان نینوں کی گہرائی کا

دل کے پھپھولے، پاؤں کے چھالے پھوڑ کے لذّت ملتی ہے
راہِ وفا میں خوف کسے ہے سوزشِ آبلہ پائی کا

آپ ہمارے درد جگا کر کب تک چین سے سولیں گے
آپ کو بھی مجبور کرے گا درد اسی شہنائی کا

اس کے تاگے پیار کے بندھن ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے
پھر بھی ہمیں تڑپا دیتا ہے نام کسی ہرجائی کا

نین کنول اسیال کٹورے، زلفیں ناگن، کالی رات
اس پہ قیامت حسن کی شوخی اور عالم انگڑائی کا

عابدؔ شکل و عقل سے عاری دشتِ جنوں میں جا بیٹھا
تجھ کو قلندر بن کر ڈھونڈے کیا کہنا سودائی کا

غزل!

صد ہزاراں داغ ہیں اس سینۂ صد چاک میں
جن سے روشن ہیں ستارے دیدۂ نمناک میں

کیکیا اٹھتا ہے ہر اک عضو، مرے جسم کا
جانیے کیا بات ہے اُس کے قبا کے چاک میں

سینکڑوں تارے تمناؤں کے چمکے بارہا!
جب کبھی آئے ہو تم مرے خیالِ پاک میں

جب کبھی وہ روئے روشن سامنے آجائے ہے
ولولے اٹھا کریں ہیں اس دلِ غم ناک میں

سوکھ کر کانٹا ہوا ہوں اُن کی خاطر دوستو!
جن کی خاطر مبتلا ہوں گردشِ افلاک میں

زُلف سائے کی طرح یوں رُخ پہ بل کھاتی رہی
جیسے بادل چھا رہے ہوں وسعتِ افلاک میں

روز و شب ہادیؔ رہا گردش میں جن کے واسطے
پاس ہی بیٹھے رہے وہ سایۂ ادراک میں

لطیف گجراتی

غزل

ہمیں نے بات کی تھی پیار کے ساتھ
ہمیں مارے گئے تلوار کے ساتھ

کبھی مارا ہمیں انکار کے ساتھ
کبھی زندہ کیا اقرار کے ساتھ

خدا لگتی کہو ہو ساتھ کس کے
ہمارے ساتھ یا اغیار کے ساتھ

گئے تھے پرسشِ بیمار کو ہم
محبت ہو گئی بیمار کے ساتھ

کبھی تنہا نہ ہنستے ان کو دیکھا
ہمیشہ گل ہنسے ہیں خار کے ساتھ

سنی ہو گی اگر دیکھی نہیں ہے
جو گذری عشق کے بیمار کے ساتھ

لطیف اس راہ سے شاید وہ گزریں
کھڑا ہوں منتظر دیوار کے ساتھ

—:—

محمد رفیق ضیاء

غزل

گئے تھے اُن کی محفل میں کرم کی التجا لے کر
پلٹ آئے ہیں لیکن لذّتِ جورَ و جفا لے کر

عجب دیوانگی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے!
گزرتی ہے جو کوچے سے تیری خوشبو صبا لے کر

ہر اک موجِ رواں دامِ بلا بن کر ابھر آئی!
میری کشتی کو ساحل سے چلا جب ناخدا لے کر

وہی شاموں میں بے رنگی وہی صبحوں میں بے کیفی
جئے جائے کہاں تک کوئی کل کا آسرا لے کر

دلِ پُر سوز بھی دنیا میں اک طرفہ قیامت ہے
ہزاروں آندھیوں کی زد میں بیٹھا ہوں دیا لے کر

کوئی اے کاش آجائے بصد اندازِ محبوبی!
تڑپ دل میں تبسم لب پہ آنکھوں میں حیا لے کر

ضیاء احساسِ خودداری پہ کتنی چوٹ پڑتی ہے!
کسی کے پاس جاتا ہے کوئی جب مدعا لے کر

غزل

آخر بچھڑ بچھڑ کے سہارے چلے گئے
نشّہ اڑا تو ولولے سارے چلے گئے

شب بھر رہا یہ قافلہ تیری طرف رواں
آئی سحر تو رات کے تارے چلے گئے

بدلے ہوئے ہیں عشق کے لیل و نہار اَب
وہ غم گیا وہ درد کے مارے چلے گئے

سوچو تو دردِ دل کا کنارا نہیں کوئی
تا لامکاں دل کے کنارے چلے گئے

ہر ہر قدم پہ آپ کو آواز ہم نے دی
ہر گام پہ تمہیں کو پکارے چلے گئے

جن کے طفیل زندگی تھی زندگی قمر
رخصت ہوئے وہ دوست وہ پیارے چلے گئے

قمر آل محمد اولڈ سٹوڈنٹ

AL-MANAR

OCT., NOV., DEC.,

1966

Talim ul Islam, College

MAGAZINE

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE, RABWAH

MAGAZINE

OCT., NOV., DEC.

1966

Professor-in-Charge

HAMID AHMAD CHAUDHRY M.A.

Editor-in-Chief

NAEEM OSMAAN

Editor

MOHAMMAD SHABBIR

Assistant Editors

SAYED ANWAR BAHARI

TAHIR AHMAD ARIF

CONTENTS

1. Editorial ... 1
2. Revive Traditions Old ... 4
   Anonymous
3. Rabwah—The Place with a Purpose ... 5
   Naeem Osmaan
4. Justice ... 11
   Mohammad Zafarullah
5. Obituary ... 12
6. Come Fly! ... 13
   Mohammad Shabbir
7. A Haunted House ... 14
   Syed Anwar Bahri
8. Oh! Thou Cruel One! ... 16
   Naeem Osmaan
9. To the Editor ... 18
10. Blessing of Science ... 20
    Usman Akbar
11. A Dream ... 21
    Anwar Ahmad
12. Rupee ... 24
    S. O. S.
13. Introducing ... 25
    Reporter
14. الادب فى العصر العباسى ... 29
    محمد اسلم شاد منگلا
15. نبذة من اشعار سيدنا المسيح الموعود ع ... 32
    اليس شهناز
16. ,, ,, ... 33
    منور سلطانه

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah, and published by Junaid Hashmi for Talim-ul-Islam College, Rabwah, W. Pak.

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE, RABWAH
MAGAZINE

Vol. 17	*Oct., Nov., Dec., 1966*	*No. 3*

EDITORIAL

Al-Manar is once again in your hands. It has always been the policy of the Editorial Board to present an appreciable issue of the magazine and to achieve this goal articles of various tastes are published which are selected from among the contributions of the students. But it is a sad fact that we are always disappointed by the general attitude of the students. Notices for contributions and even personal requests by the members of the Editorial Board do not bring a favourable response. To present a good magazine with a variety of tastes, the Editorial Board ought to have a nice selection of contributions. But when hardly sufficient articles to compile a normal issue are recieved, it should not be expected of the Editorial Board to present a

very nice issue with a wide range of articles.

Al-Manar is a magazine of the students, for the students and by the students. It is a magazine that belongs *to* the students of the College. It is published *for* the benefit of the students and it is compiled *by* the students. The Editorial Board is merely a machinery that collects articles in raw form among the students and presents them back in the printed and published form. Without the co-operation of the students this machinery cannot work efficiently. The Editorial Board is selected from among the students, only to do the technical work of the magazine and the merits of an appreciable issue do not applaud the efforts of the members of the Editorial Board, but to a major extent the appreciation is vested in the contributors.

Some students entertain a notion that writing is a very difficult task. Writing is a simple art that is neither inherited nor gifted but learnt after a little hard work. And the practice of it is the only way to achieve its proper talents. No one is a born writer, but it is the *lust* and *desire* of writing that makes a perfect writer. It is not necessary for a writer of the college standard to have a very large vocabulary. The basic of English language are quite sufficient to write a short story or an essay. And simple, plain English is better appreciated than many syllabed words. Some writers of great eminence namely Bernard Shaw, Samuel Bulter and Joad in their writings have strongly criticized the use of un-familiar words and on the other hand appreciated the use of simple common language. 'Clear thinking, plain expression and correct observation,' says Joad, 'are the essential qualities of good writing and if these are acquired, good style would be automatically acquired.' The use of un-familiar

words is not a merit at all, but on the other hand it reveals the lack of confidence of the writer. Simplicity of narration and directness of expression are what impress the reader.

At this point we cannot refrain from pointing towards the discouraging attitude of the post graduate students of our college. It is a sad fact that the cream of our college and the most learned and well-versed students have adopted such an indifferent attitude. Inspite of repeated requests to the M.A. classes, through their Professors, the Editorial Board has had no favourable response from them. The M.A. Arabic students being the senior-most are expected to set an example for the juniors. If the senior students act favourably towards the college magazine, their example can be followed by the junior students and this can inspire the spirit of writing among the juniors. Al-Manar is one of the literary activities of our college and it should be given the top priorty. There is no other activity of the college that can compete the status of the magazine, because this is the only sphere that offers a wide scope of broadening the intelligence and knowledge of the students and it is the best media of expressing the thoughts and ideas which can benefit the other readers also.

The Editorial Board finally appeals to the students to pick up their pens and papers and write something for the future issues of the maagzine. The Editorial Board particularly appeals to the Pstograduate students to start the campaign and set an example for their juniors. This tallent if once mastered will help them in the future also. The Editorial Board promises the best co-operation to the contributors and if unfortunately some students is unable to have his article published in time he should not be discouraged because the fruits of hard labour are never destroyed. Some day sooner or later they bear the fruit.

Revive Traditions old

Anonymous

Gallant fighters and Islams precious children,
Until victory with promised plebescite—
Revive traditions old—struggle for thy brethren,
Lest enemy erase all; ruthlessly with genocide.

Though a policy sought for eternal peace
For Right, Sovereignity determined stand.
In aggression, oppression—resist and sacrifice
Blood and tears, thy Faith doth demand.

Fight for Honour and the promised people
Crush the hindering weeds, and show the World
Thou art made from a nobler staple,
And willing to return the Gift, given by Lord.

Wake, ye country-men and advance
While from across the sky, the trumpets herald
The peaceful dawn of another brighter seance.
When one shall be all, and All one.

Naeem Osmaan

RABWAH

The Place With a Purpose

Rising at the banks of River Chenab, on the plains of Punjab and deep in the bossoms of the surrounding rocks lies a small desert. No more than a vast sky of sand and an ocean of slime could be seen on this stretch of land where today lies a small town of the future expectations—the town of *Rabwah.*

Just like the wise men of the East were led by the guiding star to the place of Jesus's birth, the Head of the Ahmadiyya Community, the late Hazrat Khalifatul Masiah II (May Allah be pleased with him,), was led to this vast stretch of un-inhabited desert where now stands the well planned Rabwah, by a dream after the partition of the Indo-Pak. Sub-Continent. This desert of sand and slime was named after its high expectations of the future and none suited better than the one that meant high—Rabwah.

Before the Ahmadiyya Community settled here, this stretch of land could not even experience the ugly cries of valtures that lived on the flesh of dead animals, to leave alone the pleasant humming of birds. But the Ahmadiyya Community brought its blessings for this neglected gift of the All-Mighty and thus the development of Rabwah began.

The first immigrents to this land faced immense difficulties, but their spirits were such which could not be easily discouraged by a handful of hardships. The biggest problem they had to

face was the lack of the source of life—*water*. It was a play of nature that a land stretching from the banks of one of the greatest rivers of Punjab, *River Chenab*, the hope and blessing for thousands of agriculturists lacked good consumable water. But the Ahmadis did not lose heart and put all their creative efforts in the campagin of obtaining good water. The labour of mankind is never destroyed by its Creator and the fruits of the labour of these people bloomed when a number of good consumable water wells sprang up in Rabwah.

The major problem overcome, the community stepped further in the development of Rabwah. Every dawn brought with it a number of magnificient achievements and every sunset brought the hope of another successful day. The un-tiring efforts of these people are what make the Rabwah of today a reality. The plannings of the past and the contributions of today have made this town of future expectations the pivot of spreading the gosphel of Islam to the remote corners of the world. The foundations of Rabwah were laid with the aim of spreading Islam and today Rabwah does not fall short of the expectations of its founders. It right fully and proudly can claim to be the spring and source of the universal Islamic progress.

Rabwah, today thrives with a population of over fifteen thousands residents of all classes. And this miricalous population in a short span of time, enjoys more and better facilities than a score of other older and more densely populated cities enjoy. This small piece of land that did not promise a few feet of grazing land could not be expectcd to be a source of knowledge for hundreds and thousands of human begins not only of Pakistani origin but of foreign nationalities too.

Rabwah to its credits of development has few of the best educational institutions in Pakistan. The Talimul Islam College

for Men, attracts students of different communities from all over the world. The decent reputation of the college appeals to the parents who send their children from as far as Africa, America and Far East Asia. And the Talimul Islam College stands aloof in the laps of simplicity always proud to boost its universal reputation, respect and dignity. The Jamia Ahmadiyya Religious Institute stands in the heart of Rabwah with its modern buildings, extending the rays of spiritual knowledge to enlighten the darkened corners of the world. It produces from among its students the '*Lions of Islam*' who with undaunted spirit and knowledge go forth in the wilderness of ignorance and evil to baptise the human thoughts and hold high the banner of Islam and Divinity. They dig the springs of divinity for the lost sheep of the house of Adam and defeat the un-Godly and Satanic elements that spread the poisenous infection of God-less feelings.

Women in Islamic society enjoy a very respectable and honourable position. The need of their welfare has always been, since the desend of the Holy Prophet (May peace and blessings of Allah be upon him), one of the main challenges to all the Islamic communities. Under the present modern society, where all the barriers of differences between men and women have been thrashed down, educational welfare of women has for-warded one of the most tender and difficult challenges. But the founders of Rabwah did not give a deaf ear to the resound-ing echoes of the urgency of female literacy as an uneducated mother can prove to be the worst enemy of the moral and ethical standard of humanity. To meet this need of the pre-sent and challenge of the future the Jamia Nusrat College for Women was founded to educate the mothers and the sisters of the nation. And today, the excellent standard of education and the complete privacy of women offered by the Jamia Nusrat

attracts mentally clean and pure students from all over Pakistan and the presence of foreign students proves the universal popularity of the college. Besides these, a number of nursery, model and secondary schools have been placed at the disposal of the residents of Rabwah.

Recently, the town has been altered by a number of new ultra-modern buildings. The unique Khuddamul Ahmadiyya (Ahmadiyya Youth Movement) Hall constructed adjecent to its old offices bears the proof of the expected architectural modernisation of Rabwah. The Waqf-e-Jadid and the Municipal Committee buildings have been erected too and another major step towards the development of Rabwah has been the recent construction of a large water reservior. Another shopping centre, besides Gole Bazaar and the Mandi is under construction opposite the Khuddamul Ahmadiyya Hall and it revals the confidence of the business community of Rabwah.A third higher educational building, a beautiful ultra-modern architecture of glass and marble, rising on the banks of Chenab, surrounded with green lawns and beautiful gardens reflects the break with traditions and is perhaps a glimpse of things to be expected in the town of future glories.

Not forgetting the major purpose for which the foundations of Rabwah were laid, a Central Office has been built from where all the affairs of the Community are controlled and from where the directions for the universal Islamic progress are relayed. A foreign department has also been set up and the Tahrik-e-Jadeed building has been constructed for this department. Mosques in different parts of the town have been built and many more are under construction. Printing departments for publishing literature in different languages of the world have been installed.

Owing to the great crowd of local and foreign visitors the

Community manages three guest houses solely on its own expensis. During the days of Annual Gathering people from all over the world flock in thousands. And these guest houses provide all the visitors with free accomondation and food.

A small hospital to provide medical facilities to the people of Rabwah and the surrounding rural areas is being maintained on community expensis. The Fazal-e-Omar Hospital has a working staff of four qualified doctors and trained X-ray technicians besides the other staff. The equipment in this hospital is claimed to be of the most recent patterns. The hospital also manages an ambulance and a mobile dispensary.

The rapid progress of Rabwah did not leave much reason for the Government to be convienced that the Ahmadia Community meant to stick to this desert and shape it into a modern town. A railway station was generously built by the government for the convenience of the public travelling to and from Rabwah. A post and tele-communication office has been placed at the disposal of the residents and a telephone exchange, another media of fast communication in the present world of scientific advancement has been installed. These major contributions by the government prove the faith of the present regime in the people of Rabwah.

The remarkable aspect of the town is revealed by the absence of cinema hall; dancing and night clubs; gambling and betting tables and other material petty entertainments of the present world. Rabwah upon its area of nearly a thousand acres enjoys a purely religious atmosphere. The simplicity with which the rich and the poor lead their lives would astonish even the simplest pagans of the world. The degrading evils and set-back of the present highly materialised society of the world lie on the out-skirts of the minds of Rabwans. The

concept of materialism and modernisation in practice is a vast region of vagueness to their spiritually inclined thoughts. Life in this transit would to these people is a snow-ball rolling from high mountains, that is to hit some boulder after a steep fall and break, but nevertheless doing a service to mankind by clearing the path for the on coming ones. Thus they care less for life in this world but strive for an honourable position in the hereafter, not for themselves alone but for the world on whole.

Thus there under the shinning sun of summer and the cool clouds of winter stands the desert that once meant nothing to anyone but today owing to the unshakable faith and sincerity of its reclaimers and the sagacity of its first inhabitants, it stands as a hope of thousands. The land that once could promise no more than a battle-field for the blood thirsty warriors today stands as a spring of spritual life for millions, resounding to the nooks of the world the echo of Islam—Peace. Thus there stands Rabwah—the place with a purpose.

Justice

Justice is their plea,
But just they never are;
From danger do they flee,
They say brave men they are.

Patriots are called the men,
Who, at time of danger,
Seek a safe den :
In peace they prove, dogs in manger.

To himself, he conceals,
A valuable truth;
With it to grave he reels,
Wise man's called the brute.

For wine and woman he yearns,
Worthless verses composes;
And still, a fame he earns,
On "Great poet" they shed roses.

To truth, universel truth calls he,
Flag of religion he raises,
Kaffir, Kaffir, a Kaffir, is he,
It is the way the mob praises.

Created us, the Mighty of the Mightiest,
Gifted with wisdom, and made excellent,
Majority calls, creation at best,
"A mere chance, an accident ! "

OBITUARY

We place on record, our deep sense of grief and loss on the sad demise of Hazrat Maulana Jalal-ud-Din Shams Maulana Sheikh Abdul Qadir and Hazrat Qazi Mohammad Zahur-ud-Din Akmal. They were great sons of the Promised Messiah (peace and blessings of Allah be upon him). With their devotion and selfless service to the cause of Islam they have set an example for the posterity.

May God shower His choicest blessings on the departed souls and enable us to follow the great example of sacrifice and service set forth by them, Ameen.

Mohammed Shabbir

COME FLY!

In the midst of silient, leafless boughs,
Among the grassy glades where tall reeds bow.
Walks one who of Potion fully drank--
Of heart a mistress he made. Who shrank
As the ebb, flowing away with desires unquenched,
Heavy is the bossom and the eye unshed.

A melancholy melody floats from a birds lair
Benumbing pain steals unseen, unaware—
Thoughts unpleasant linger and fade as visions,
Reminding vanquished desires and condoned passions.

No murmer leaves from once laughing lips
Yet from far a lonely wail rips—
"Come fly, come fly, come fly to me
In immortality love and happiness abound
Not in fragile shells destined to end.
In my fold, safe from sight thou be".

Syed Anwar Bahri

A HAUNTED HOUSE

It was a winter evening, three months ago, when I went to Lahore. I had thought of going to a hotel but on a second thought I decided to visit a friend who lived in a nearby suburb. It was quite dark when I knocked at his door and was disappointed to know that he had gone to Karachi for a few days. As there was no male member of the family at home, I did not think it right for me to stay there. I could hardly decide where to go with a heavy suit-case at that late hour of the night with no transport available. But then I saw an elderly man coming from the opposite direction. Seeing me standing in a dejected mood, he stopped, wished me good evening and asked if he could be of any help. Putting all the formalities aside, I told him my difficulty in as few words as possible. He thought for a moment and then offered his hospitality. I had no choice but to accept. So I followed him to the outskirts of the locality. He stopped at a house, unlocked the door, took a lantern and lit it. I found the house a deserted one. A bat was hovering. A beetle was droning. Everything looked old and unpleasant to the eyes. My host brought something to eat which was all the more unpleasant and after helping myself with the meals I went to sleep.

It was hardly midnight when I felt someone awakening me. I opened my eyes but could not see any one in the pitch dark. I went to sleep again but I was again awakened by a rustling sound. The sound scared me as I could not

see anything. I remained awake for sometime but fell asleep again. I had been asleep for quite a short while when I heard someone talking in low tones. All I could hear was a baby saying, 'Dear brother, are you cold ? ; and another baby saying in reply, 'No dear, but are you cold ? ' I was afraid as I felt the sound coming from inside my bed. I could not keep myself awake for long as I was very tired. Yet no sooner did I go to sleep that a child's voice spoke, 'Dear brother, are you cold ?' and there was a reply, 'No dear ! but are you cold ?' This time it was heard so clearly that it left no doubt in my mind. There were certainly two children hidden inside the bed. It was near about four in the morning. I gave up the idea of going to sleep again and waited patiently for my host to get up. Soon he woke up too. When he saw me sitting in a gloomy mood, he came straight to me and enquired if I had had a sound sleep I tried to evade the question but on his persistance I had to tell him of my experience. He said that he had occupied the house only a few days ago and took me to a neighbouring old man. There I narrated the previous night's happening. The old man sighed and then spoke slowly, telling me that two children of a very young age had been deserted by their widowed mother. The children remained shut in the house throughout the chilling winter night without proper clothing. The third day, when people opened the door by force, the children had been frozen to death. Since then such voices have been heard during the winter. And from that day, I made up my mind never to accept offers of staying at the houses of strangers, as you can never know whether it is a hunted house or not.

Naeem Osmaan

O! Thou Cruel One!

Thou came, thou knocked, thou entered,
Haply, thy face on, my eyes centered;
A casual glance, there thou stood turbid,
To senses again, off for cover thou hurried.

Thou spake, an' ceased, an' again began,
Proper with grace, best as thou women can ;
Thy voice melodious sweet in night-air,
Thine gift magnificent, to thee Gods been really fair.

Thy voice I heard, smooth and slow,
As calm streams, smoothest could flow;
Somewhere deep my senses had sunk,
As though of opiate, I had over-enough drunk.

About to go, out thou came,
Thy voice boony, thou still more tame ;
Thine sight enough—my heart was boom.
A stolen glance—thou understood—an didn't swoon ;
Another glance—our eyes did meet,
My soul trembled, thy lips shivered—memories are sweet.

But Alas !
The lips that smiled, the eyes that shone,
Didn't stay long—like thunder thou wert gone;
Sad memories repent the night,
Yet sweet memories, parch thy sight;
But thou art gone—gone for ever.

Hope and Patience !
Would thou return ? I know—never.
Yet I wait and hope does grow,
Till to death-bed—mine thou throw.

Oh ! tender one ! thou cruel one !
Thou saw, thou spake', thou smiled,
Myself I chide, what avails I aspired;

Thou came, thou sat, thou went,
To pieces my heart thou rent.

TO THE EDITOR

Do your Editors usually write articles for their friends?

Osman Akber

Not usually—only when they do not have constructive friends.

How many issues of Al-Manar do you publish in one session?

Shah Nawaz Cheema

It depends upon the number of publishable articles we receive in one session.

How many articles do you reject before publishing one issue of Al-Manar?

Shah Nawaz Cheema

As many un-publishable articles as we can get.

Why was there no Urdu portion in the last issue of Al-Manar?

Abbas Ahmad

Why ask the wrong people? Inquire from the Urdu Editoral Board.

There was a proposal for a Science question—answer—column and an English Literary Society in the last issue of the Magazine. How far have the proposals been considered by you?

Mahdood Ahmad

As far as the Science question and answer column, is concerned we approved the idea and it depends upon the Science students to organise it. If it is approved by the Professors of Science we will publish it. Regarding the formation of an English Literary Society, we published the proposal and it has to be considered by the worthy Principal and the members of the staff.

Why didn't you publish a 'Quotes Section' in the last issue of the magazine?

Ahmad Yar Khan

It is not a *regular feature* of the *magazine*.

Why is Al-Manar being published so late?

Mubashar Ahmad

This issue was supposed to be distributed by the end of December. How late is it?

There are a few articles that are written with great pains by the students, but they are not published. This discourages the students and they do not take pains to write for the magazine again. Why have the students Editorial Board adopted such a discouraging attitude?

Anonymous.

The Editorial Board does not wish to discourage any student. It is our policy to publish any article that is worth publishing even if it needs major improvements. The articles are first checked and approved by the student editors and then all of them are forwarded to the Proffessor-in-Charge, who has the final authority to select or reject articles. Before publication some articles are rejected by the Editor-in-Chief too but they still have to be forwarded to the in-charge for final decision.

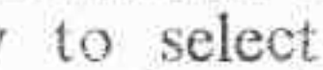

The Girls College published an '*Al-Musleh Mawood*' Number, to honour the soul of the great Imam of Ahamadiyyat. Dont you think it was obligatory for you to publish the same, to honour the man who has burdened our lives with his blessings?

Shahid Ahmad

It was not only obligatory for us but it was our duty and we have already published the Oct. Nov. Dec. 1965 issue of Al-Manar to honour the departed soul of Hazrat Musleh Mawood, (May Allah be pleased with him, Ameen).
Al-Manar goes with time.

Usman Akbar

Blessings of Science

Science they say is a Bliss to us,
But science has made our lives a fuss.

Telephones made for us communication easy,
And lover's too, on telephone ends, in chats are busy,
T. B. and Cancer, cures, a doctor with skill,
But in splits of seconds, millions does a pilot kill;
Atomic energy, science's magnificent construction,
In Nagasaki and Hiroshima wrought its destruction.

VCIO's an' 707, fly London-Tokyo over-night,
Passengers travel with them on magnificent heights;
Comfortable they are, as much as large mansions,
But aircrafts bring to us, latest Hollywood fashions;

Radio to us, brings the international news,
And own radio students forget payment of dues;
Show programmes of Lahore to them are known,
For Lahore they rush—to see movies, that are shown;

Still !
Science they say to us is blessed,
Forgetting our lives it really has messed,
Busy we are in science's magnification,
Mankind truly has, forgotten—its destination.

Anwar Ahmad

A DREAM

In the middle of a dense jungle stood a little clearing with a small village of about fifty huts. The inhabitants of these huts were dancing around a pole to which I was tied. Anyhow, let me tell you how I got there.

I was going hunting with some of my friends. While we were flying over the jungle looking for a place to land, something went wrong with the engine of the aircraft and we were asked to jump. But I was the only man who got a chance to jump before the plane caught fire, and while I was whizzing through the air down towards earth, I could see the plane spinning downwards and crash in the dense jungle.

It was lucky for me that the jungle was very thick and saved me from hitting the ground. For three weeks I had nothing to eat, and had to search the jungle for some eatables. After three weeks I came upon a clearing and saw some natives working. I had just enough strength left to walk to the first hut and ask for something to eat, but before I could manage that I crumbled to the ground. I heard a shout and about two hundred native-warriors gathered around me. They were talking and jabbering in their own language, and through half-closed eyes I could see that they were head-hunters, and I knew that my end had come. They put me in a small hut and tied my hands and feet. After I had been given a good feed and had slept well the Chief came in and told me in broken English that the "Ceremony" would take place the following morning.

That night I could not sleep, and at dawn, two native warriors led me to a long pole in the centre of the huts and tied me to it. After a little while a "Medicine-man" came out painted with gaudy red, orange and yellow colours, with a big ape's head on his own, a number of shrunken heads tied around his waist, a big bone sticking through his nose, a kind of rattle in one hand and some powder in the other, which he kept sprinkling on me. This I though he was doing to frighten evil spirits away. For about a quarter of an hour he kept dancing and throwing the powder on me. After the Medicine-man had finished, a warrior came forward and started dancing around me chanting some sort of prayers. When the dancing and singing finished, I was taken to a huge stump of a tree and was made to kneel down and put my head on it, while one man stood with a huge machete to cut my head off. All I heard was a rifle shot and I do not know what happened next, for I lost conscious till I felt water being poured on my face and realized that the ropes with which the natives had tied me had been removed, I sat up and rubbed my eyes, then looked around, and saw an officer of the British Army sitting by my side and a whole lot of soldiers taking up the dead bodies of the head-hunters and burying them.

I felt quite weak after the experience. The Officer asked his men to look after me. I ate and drank hungrily and while I was eating, the British officer told me that the British had been making a road through the jungle, when they heard the warriors cries. They immediately sent a search party and finally found out the people and saved me.

I told him how I had got myself in the trouble and the next day the officer sent me to a nearby airstrip.

I caught a small Dokata that took me to a big city from where I caught a big plane home. I was very glad to land on my mother-land and when the aircraft-gates opened and the landing-stairs were fixed, I tried to rush to the ground, but my foot slipped and I fell down the stairs. I fell with a big 'thud' and immediately woke up. Believe me I had been dreaming and had fallen to the ground from a double-bed.

RUPEE

Made was I, by a simple man,
Who his work, wanted to make easy.
But never thought he then—Men
Intoxicated will be—after me busy.

A thing thou made to be thy slave.
But me thou couldn't master,
And now are thou, my pet slave,
Thine heart I master, and master thy soul,
Without me—man—thou can never be whole.
Eyes comfort I am—and thine stomach's diet,
For me thou all—do toil the night.

Night and day, do thou yearn,
But little of me, do thou earn.
None do possess me,
Neither king nor begger,
I to all, remain the same,
Matters to me—neither name nor fame.

All do know—I'm dirt of hand,
Being possessed, is what I cant stand,
Free am I—none can hold me tight;
One to other I keep on moving,
None can stop me—nor what I am doing.

Thine father if old—thou let him alone;
Thy mother sick, thou let her groan;
Old and sick, for thou have no charm,
Of me thou greed and me thou worship.

When old too—I never go stale,
Mankind—thou art—always at my tail.

INTRODUCING

STUDENT'S UNION

President : Parvez Tariq B.Sc. Final.

Parvez was elected President of the T.I. College Union for the current session. He had a landslide victory over his opponent Majeed Gillani of B.A. Final.

Parvez is a debator of remarkable talents and has won a large number of prizes in various Urdu debates.

Secretary : Muhammad Nawaz Khan B.A. Part One.

Nawaz defeated his opponent Sami Tahir also of B.A. Part One with a slight majority of twenty three votes and was elected secretary of the union. Nawaz served the college union as a debator last session.

Assistant Secretary : Ghulam Hassan of F.A, Second Year was once again elected to the college union this year. He holds the portfolio of assistant secretary.

Joint Secretary : Shuja-ul-Haq F.A. First year.

Shuja, the little boy of the college won the joint secretary's election with a majority of votes. Shuja has been a debator during his school time and if given a chance the little boy can be a big debator.

Cabinet Members :

Once again this year, debators of the college were

appointed to the cabinet of the Students Union, in place of class representatives. The following were appointed as cabinet members.

Sahibzada Jameel Latif B.Sc. Final.

Jameel had been a senior urdu speaker, and has served the College Union as the secretary, cabinet member and also an urdu speaker during the past sessions. He was declared the '*Best Speaker*' during the session 1964-65 and won a '*Roll of Honour*' in the last session. He serves his second term as a cabinet member.

Majeed Gilani B.A. Final.

An urdu as well as an english speaker, Gilani serves his first term as a cabinet member. He has previously been a speaker of the college.

Naeem Osmaan B.A. Part One.

A senior English speaker, Naeem has served the College Union as an English debator and a cabinet member. He was awarded the '*Best Speakers*' award for the session 1965-66. He serves his second term as a cabinet member.

Abdul Sami Tahir B.A. Part One.

An urdu speaker, Sami is serving the College Union as a cabinet member for the first term.

Mirza Farid Ahmad F.Sc. Second Year.

Farid, an urdu speaker, has served the College Union in the capacity of a speaker and a joint secretary. He has been appointed to the union cabinet for the first term.

Abdul Basir F.Sc. First Year.

Basir is an english speaker and has joined the college this session. He has been appointed to the union cabinet for the first session.

AL-MANAR (Urdu Portion)

Editor-in-Chief : *Hadiatullah Hadi* M.A. Part One

Hadiat served the college magazine as an assistant editor during the past two session. He has been appointed as editor-in-chief for the current session. Hadiat has served the college magazine as a regular contributor throughout his stay in the college.

Assistant Editor : *Latif Gujrati* B.Sc. Final.

Latif has been a regular contributor to Al-Manar since he joined the college. He has been appointed as an assistant editor for the current session. Latif is a budding poet too.

Sub-Editor : *Bashir Tahir* F.A. Part One.

Bashir has been appointed as a sub-editor for the first term. A student of advanced urdu, he is expected to be do justice to his responsibility.

AL-MANAR (English Portion)

Editor-in-Chief : *Naeem Osmaan* B.A. Part One.

Naeem Osmaan has previously served the editorial board of Al-Manar as an editor during 1964-65 and editor-in-chief during the past session. He has been appointed to the editorial board for the third term, and serves the college magazine in the capacity of the editor-in-chief for the second term. Naeem has been a regular contributor to the college magazine since he joined the college.

Editor

Muhammad Shabbir B.Sc. Part One.

A budding poet and a writer Shabbir has served the college magazine as an assistant editor during the past session. He serves his second term as an editor.

Assistant Editors

Syed Anwar Bahri F.Sc. second year and *Tahir Arif* F.Sc. first year have been appointed as associate assistant editors for their first terms.

The following have been elected senior office bearers for the other societies of the college.

Arabic Society.

President : Muhammad Aslam Shad M.A. Final.
Secretary : Nusrat Ahmad Bajwa B.A. Part I.

History Society.

President : Masood Ahmad Khan B.A. Part I.
Secretary : Khuda Baksh Bhatti F.A. II year.

Science Society.

President : Rashid Ahmad Khokhar B.Sc. Part II.
Secretary : Sardar Latif Ahmad B.Sc. Part I.

Bazm-e-Urdu

President : Syed Anwar Bahri F.Sc. II year.
Secretary : Munawar Ahmad Anis F.Sc. I yeyr.

Economics Society.

President : M. Rafiq Zia B.A. II year.
Secretary : Abdur Sattar Khan B.A. Part I.

Philosophy Society

President : Izaz-ul-Haq B.A. Part II.
V. President Mohammed Nawaz Khan B.A. Part I.
Secretary : Bashir Ahmad F.A. I year.

محمد اسلم شاد منغلا
الدرجة النهاية لما جستير

الادب فى العصر العباسى

الادب عند قدماء العرب مختلط والادب عندهم النحو والصرف والقوافى و صفة الشعر والشعراء و اخبار العرب و كل من ضرب سهماً فى واحد من هذه العلوم عد فى الادباء - فى فجر الاسلام تشوق الناس فى جمع هذه الآداب والاقوال والاشعار والاخبار والامثال - لانهم كانو يستفيدون من هذه الاقوال فى ترجمة القرآن و تفسيرها- كما قال حضرة عبدالله بن عباس " اذا قرأتم شيئا من كتاب الله و لم تعرفوه فاطلبوه فى الاشعار لان الشعر ديوان العرب،،

العصر العباسى الاول :- اظهر الخلفاء فى هذا العصر رغبة شديدة فى الادب و خاصة فى الشعر - و كانوا يكرمون العلماء والادباء ويعظمون آرائهم - لم يكن الادب محصورا فى صنعة الشعر فحسب - لكنه اجتاز الى جميع انواع الادب والفن و اجتمع اكثر من الادباء والعلماء من الكوفة والبصرة و من انحاء الجزيرة فى بغداد كانوا يقيمون المجالس الادبية و يناقشون فى العلم و الادب - و كانوا ينشدون الاشعار و يتسابقون فى هذا المضمار - و هذه المجالس والمناقشات والمناشدات ان دلت على شيئى فانما تدل على نشاط الحركة الادبية فى هذا العصر -

وانعقدت مجالس المذاكرة بين الاصمعى و ابى عبيدة وكان هارون الرشيد كثيراً ما يسمع الشعر منهم لانه كان محبا للعلم والادب - و فى هذا العصر كان الشعرا القدماء ينظرون بنظر النقد - و كان ابونواس وغيرها رفضوا ان يسلكو طريق القدماء -

و هذا من العجب ان اكثر العلماء والادباء فى هذا العصر كانوا يتعلقون بالعجم لان العرب فى هذا العصر كانوا قليلى الرغبة فى العلم والادب لانهم اشتغلوا فى السياسة ـ والاعاجم دخلوا فى الاسلام فى ذالك العصر و كانوا من فارس والعراق خراسان و رغبوا كثيراً فى طلب علم النحو ـ لان اللغة العربية كانت غريبة لهم ـ وهم مكثوا فى الكوفة والبصرة لقرابتهما من البداوة ـ

و بعد ذالك كان العراق مركز العلم والادب ـ ولد فيها العلماء والفضلاء وخرجوا منهم الراوون للعلوم الدينية كانوا يتعلقون بالعلوم المختلفة و يسافرون فى البلاد لسماع العلوم ـ ثم كانوا يحضرون المجالس العلمية والادبية يستفيدون منها ـ وكان اشهرهم الاصمعى و ابوعبيدة والمفضل الضبى وحمادن الراوية ـ

العصر الثانى

خطا الادب فى هذا العصر خطوة اخرى نحو النشوء والتفرع و كانت الادب فى العصر الماضى مختلط و يدرس الادب والنحو واللغة والاخبار معاً ـ و قليل منهم تفرقوا لواحد منها ماعدا النحو ـ فالادب هنا ينقسم الى ثلاثة اقسام ـ الاول ـ الذى يدخل فيه الاخبار والامثال والاشعار و غيرها ـ والثانى النحو ـ والثالث اللغة

العصر الثالث

نضج الادب فى هذا العصر و زاد استقلالاً من سائر العلوم ـ ومال فى الاكثر الى النظر فى الشعراء للشرح والانتقاد و جعلوا ينظرون فى الادب كنظر الناقد فان روح النقد والنظر الفلسفى قد دب فى عروقهم ـ فنبغ منهم نقاد الشعر كمثل الجعفر و ابن رشيق وابن قتيبة ومنهم من انتقدوا الرواية والاخبار كأبى الفرج الاصبهانى صاحب الاغانى و عمر بن حمزة ـ هم نظروا الى فحول العلماء و شرحوا اقوالهم فى الجاهلية والاسلام كشرح الحماسة والمعلقات

انیس شہناز
الدرجة النهائية لما جستير

نبذة من اشعار سيدنا المسيح الموعود عليه السلام
(ترجمت من الاردوية الى العربية)

میں وہ پانی ہوں کہ آیا آسماں سے وقت پر
میں وہ ہوں نورِ خدا جس سے ہوا دن آشکار
انا الماء الذی جاء من السماء علی الوقت وانا نور الله الذی اشرق منه النهار

ابن مریم ہوں مگر اترا نہیں میں چرخ سے
نیز مہدی ہوں مگر بے تیغ اور بے کارزار
أنا ابن مریم ولکن لم انزل من السماء وکذلك أنا المهدی ولکن بغیر خنجر وقتال

اس بہار حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے
مت کرو کچھ ذکر ہم سے ترک یا تاتار کا
بهجة ذالك الحسن قد تجیش فی قلبنا أصاح لا تذکر عندنا الترک اوالتاتار

اک نشان ہے آنے والا آج سے کچھ دن کے بعد
جس سے گردش کھائیں گے دیہات و شہر و مرغزار
آتیة بعد بضعة ایام آیة تدورمنها القری و البلدان و المراتع

اب تو نرمی کے گئے دن اب خدائے خشمگیں
کام وہ دکھلائیگا جیسے ہتھوڑے سے لوہار
ذهبت ایام الرفق الآن یری الله الغضبان منظراً کمثل القیـن بالمطـرقة

جو خدا کا ہے اسے للکارنا اچھا نہیں
ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے روبہء زار و نزار
لا یحسن التهدید والنضال بمقابلة من کان لله لا تلق یدك ایها الثعلب الضئیل علی اللیوث

نبذة من اشعار سيدنا المسيح الموعود عليه السلام

(ترجمت من الفارسية الى العربية)

در دلم جوشد ثنائے سرورے
آن که در خوبی ندارد همسرے
قد یجیش فی قلبی ثناء سید لیس له کفؤ فی الفضائل

بعد از خدا بعشق محمدؐ مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم
بعد الا له انی مخمور بعشق محمد ان کان هذا کفر فو الله أنا کافر شدید

امروز قوم من نشناسد مقام من
روزے بگریه یاد کنند وقت خوشترم
قومی لم یعرفوالی الیوم مقامی سیأتی یوم یذکرون فیه وقتی الهانی باکین

چون شام، پر غبار و تیره حال عالمے بنیم
خدا بروے فرو دارد دعا هائے سحر گاهم
اذا رأیت عشیة مملوءة بالغبار وسوء حال العالم فانزل الله تعالی علیه ثمرات دعائی

هزار سرزنی و مشکلے نه گردد حل
چون پیش او بروی کار یک دعا باشد
ان جهدت لالف مرة لم تنتجح واذا ذهبت امامه کان امراً یلیق بدعاء واحد

رنگم چون گندم است و بمو فرق بین است
سید جدا کنند ز مسیحائے احمرم
انا آدم اللون وفی شعری فرق ظاهر و مولای افردنی عن المسیح الاحمر

مباش ایمن از بازئی روزگار
مکن تکیه بر عمر ناپائیدار
لا تأمن من دواعی الدهر و لا تعتمد علی العمر الفانی